
آوارہ گرد بادشاہ
PDFBOOKSFREE.PK
مولف: الیاس سیتاپوری
BONAPARTE
Courtesy www.pdfbooksfree.pk

# آوارہ گرد بادشاہ



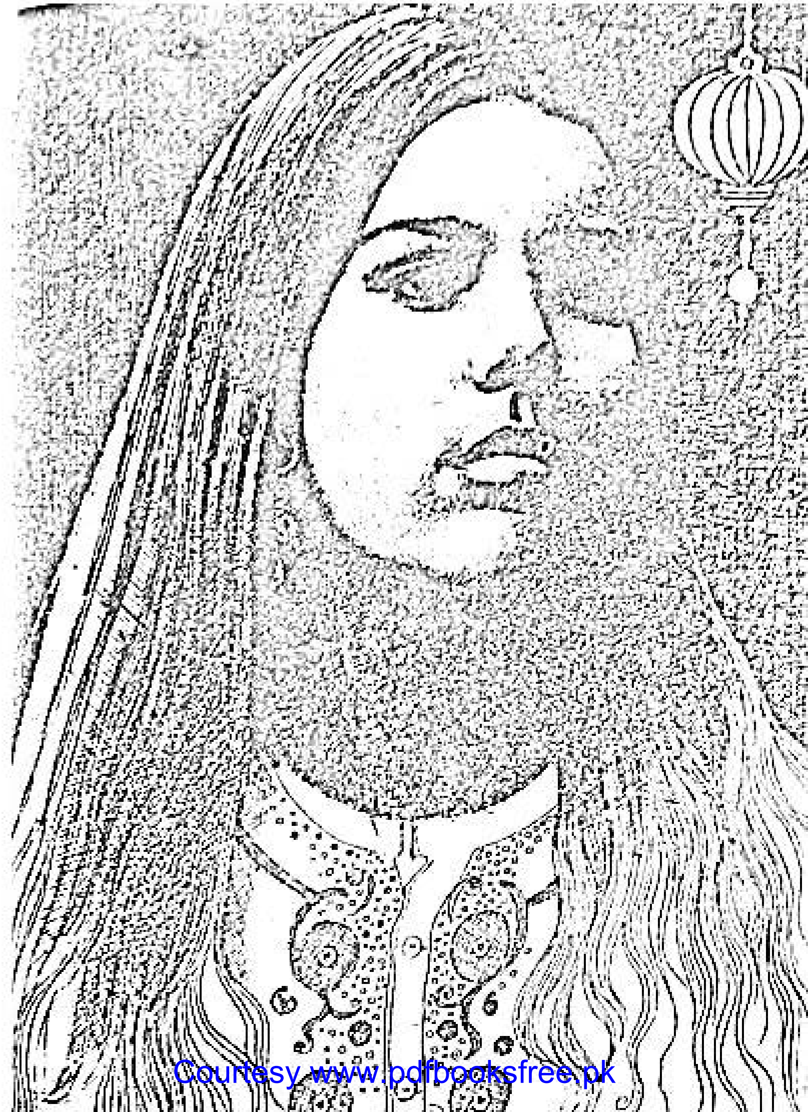
میں سخت الجھن میں ہوں کہ اپنی داستان کا آغاز کس طرح اور کہاں سے کروں کیونکہ جب میں کچھ کہنے کے لئے اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ دیکھ کر میری الجھنوں میں اور اضافہ ہو جاتا ہے کہ مصائب و ابتلا، حوادث و سانحات اور نشیب و فراز کا ایک وسیع و عریض جنگل تھا جس سے گزر کر میں اپنی زندگی کے چالیسویں سال میں داخل ہوا۔ ان میں عشق و محبت کی رنگینیاں اور جوانی کی کیف آور گھڑیاں اس طرح آئیں جیسے گھنگھور رات میں کوندا لپک جاتا ہے۔ میں نے شاہی خاندان میں پرورش پائی۔ کہتے ہیں حضرت بادشاہ ہمایوں کے بھائی مرزا کامران نے کچھ دن میری ماں کا دودھ پیا تھا اس نسبت سے میں مرزا کامران کا دودھ شریک بھائی تھا۔ میں نے اپنی زندگی مرزا کامران کے زیر سایہ گزاری لیکن بعد میں کچھ ایسا انقلاب آیا کہ مجھے مجبوراً مرزا کامران سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔

میں مرزا کامران کو آقا مرزا کہتا تھا۔ اسے کابل کی حکومت تفویض ہوئی تھی۔ ایک دن سہ پہر کو آقا مرزا نے مجھے خلاف معمول بلا بھیجا۔ جب میں ان کے پاس پہنچا، اس وقت وہ ایک بدخشی تاجر سے گفتگو کر رہے تھے۔ میں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا، آقا مرزا نے مجھے سرسری نظر سے دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش سے سلام کا جواب دے کر بدخشی تاجر سے گفتگو جاری رکھی۔ وہ کہہ رہے تھے۔ "اگر قسمت نے یاوری کی تو ہند کی حکومت بھی اپنے زیرنگیں آجائے گی، ہم اس وقت تجھے اتنا نواز دیں گے کہ تو اس وقت اس کا اندازہ تک نہیں لگا سکتا!"

پھر مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تجھے حسین لڑکیوں کی صحبت میں رہنے کا شوق نہیں ہے؟"

میں آقا مرزا کا ادب کرتا تھا لیکن دلچسپ اور پرکیف سوال نے حوصلہ پیدا کر دیا، جواب دیا۔ "ہے کیوں نہیں، لیکن جب میں اپنی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو شرمندہ ہو





جاتا ہوں!"

آقا مرزا ہنس دیئے، بولے۔ "اچھا تو تو بھی کیا یاد کرے گا، ہم تیرا یہ شوق بھی پورا کر دیں گے!" پھر بدخشی تاجر سے پوچھا۔ "اس وقت تم کتنی لڑکیاں لائے ہو؟"

تاجر نے جواب دیا۔ "حضورِ والا! کل دس لڑکیاں لیکن یہ ساری کی ساری انتخاب ہیں!"

آقا مرزا نے کہا۔ "اچھا تو کل انہیں لیتے آنا!"

"جیسا حضورِ والا کا حکم!"

آقا مرزا نے اسے کچھ نقد رقم دی۔ جب وہ چلا گیا تو آقا مرزا نے مجھ سے کہا۔

"علی مرزا! سننے میں آیا ہے کہ آگرے میں حضرت بادشاہ (بابر) سخت علیل ہیں اور زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے ہم چاہتے ہیں کہ تو چند آدمیوں کے ساتھ آگرے چلا جائے اور ہمیں صحیح صورتِ حال کی خبر دے!"

مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ میں آقا مرزا کی حکم عدولی کر سکتا، میں نے پوچھا۔ "حضورِ والا! اپنا منشائے دلی اس خادم پر ظاہر فرمائیں تاکہ اس کے تکملے کی تگ و دو میں اپنی جان کھپا دوں!"

آقا مرزا نے نہایت شفقت سے کہا۔ "ہم چاہتے ہیں کہ تو کابل اور ہند کے عظیم الشان بادشاہ کا بھائی کہلائے۔ اس وقت ہند اور کابل کے تاج و تخت ہمارے منتظر ہیں۔ تو فوراً آگرے پہنچنے کی تیاری کر اور حضرت بادشاہ کی بیماری کی صحیح کیفیت سے ہمیں مطلع کر، ہم تیری خبر کے مطابق اپنی کوشش کے قدم بڑھائیں گے!"

سچ بات تو یہ ہے کہ اس وقت اس خیال سے میں بے حد خوش ہوا تھا کہ اگر آقا مرزا ہند اور کابل کے بادشاہ بن گئے تو میں ان کے وسیلے سے بہت بڑا آدمی بن جاؤں گا۔!

دوسرے دن طلوعِ آفتاب کی دو گھڑی بعد مجھے پھر طلب کیا گیا۔ اس وقت آقا مرزا اپنی بارہ دری میں سفید چاندنی پر نیلے گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ بارہ دری چونکہ شاہی محل کے اندر واقع تھی اس لئے یہاں دن کی روشنی پوری طرح نہیں پہنچتی تھی۔ بارہ دری کی چھت سے لٹکے ہوئے فانوس اس وقت بھی روشن تھے اور ان کی روشنی میں بارہ دری افسردہ افسردہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ آقا مرزا کے سامنے دس حسین و جمیل اور فتنہ ساماں لڑکیاں ناز و ادا سے کھڑی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے اور آقا مرزا کے بائیں جانب امید و بیم کی کیفیت کا شکار کل والا بدخشی تاجر کبھی لڑکیوں کو دیکھتا اور





کبھی آقا مرزا کو دیکھنے لگتا۔ اس طرح وہ معاملے کے امید افزا یا حوصلہ شکن پہلو کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ان سراپا قیامت لڑکیوں کو دیکھا اور آنکھیں ملنے لگا۔ آقا مرزا نے پوچھا۔ "تیری آنکھ میں کیا ہو گیا۔ کہیں تجھے آشوبِ چشم کی شکایت تو نہیں؟"

میں نے کھسیا کر جواب دیا۔ "خدا نہ کرے، میں تو اچھا بھلا ہوں!"

آقا مرزا نے ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ سب تیرے لئے ہیں لیکن یہ اسی وقت تیرے حوالے کی جائیں گی جب تو آگرے والے منصوبے پر ہوشیاری اور عقل مندی سے عمل درآمد کر چکے گا!"

اس کے بعد آقا مرزا مجھے تنہا چھوڑ کر اندر چلے گئے ہم لوگ ان کا بڑی دیر تک انتظار کرتے رہے لیکن وہ واپس نہیں آیا۔ بدخشی تاجر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایک گداز اور چاہِ زنخداں والی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "جناب! مجھے نہیں معلوم کہ ان لڑکیوں میں سے کون کون سی لڑکی آپ کے حصے میں آئے گی لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ اگر آپ کو اپنی پسند کی ایک لڑکی منتخب ہی کرنا پڑے تو اس چاہِ زنخداں والی لڑکی کو ہرگز نہ بھولیئے گا!"

میں نے کوئی جواب نہ دیا، خاموش رہا، غالباً بدخشی تاجر نے آنکھ کے اشارے سے اس لڑکی کو آگے بلایا۔ وہ سر پر ایک ٹوپی پہنے ہوئے تھی، یہ ٹوپی جسے طاقیہ کہتے تھے اس بات کی علامت تھی کہ جس کے سر پر یہ ٹوپی ہو گی وہ کنواری ہو گی کیونکہ شادی کے بعد لڑکیاں لیچک باندھنے لگتی تھیں۔ لیچک ایک قسم کا بڑا رومال ہوتا ہے جس کے دونوں سرے موڑ کر سر کو ڈھانپ لیتے ہیں اور ٹھوڑی کے نیچے ایک یا دو گرہیں لگا دیتے ہیں۔

بدخشی تاجر نے لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ سے کہنے لگا۔ "ذرا اس کے ہاتھ کو چھو کر تو دیکھو کیسا نرم و نازک اور لچکیلا ہاتھ ہے۔" اس کے بعد اس نے میرا ہاتھ زبردستی لڑکی کے ہاتھ میں دے دیا اور بولا۔ "جنہیں علمِ قیافہ آتا ہے، ایسے ملائم ہاتھ اور لمبی انگلیوں والی لڑکیوں کی بابت یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعرانہ مزاج کی مالک ہوتی ہیں اور ان میں جذباتِ حسن و عشق کی فراوانی ہوتی ہے۔ یہ اپنے عاشق سے نہایت گرم جوشی سے پیش آتی ہیں!"

میں نے اس لڑکی کا ہاتھ آہستہ سے دبایا لیکن گرم جوشی کا اظہار نہ کر سکا کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں کسی طرف سے آقا مرزا نہ آ جائیں۔ اس لڑکی نے اپنی بڑی بڑی بادام

جیسی آنکھیں اوپر اٹھائیں اس کی لمبی لمبی پلکیں نیزوں کی طرح میرے چہرے پر تن گئیں۔ ایک ایسی مسکراہٹ جس کا ہونٹوں پر کوئی اثر نہ تھا، اس کی آنکھوں میں محسوس کی جا سکتی تھی۔ بدخشی تاجر ہم دونوں کی قلبی کیفیات نہایت ہوشیاری سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اتنے میں آکا مرزا آ گئے۔ میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ آکا مرزا نے کہا: "تکلف کیوں کرتا ہے۔ یہ تیری ہی امانت ہے، جو بالآخر تیرے حوالے کر دی جائے گی!" پھر بدخشی تاجر سے کہا: "ہم نے اپنے خزانچی سے کہہ دیا ہے کہ وہ تمھیں ان لڑکیوں کی مجموعی قیمت ادا کر دے گا۔"

آکا مرزا نے مجھے بارہ دری سے ملحقہ ایک کمرے میں لے گئے۔ میری پشت تھپتھپائی اور کہنے لگے "ہم نے تیری ماں کا دودھ پیا ہے تو مرزا حقیقی بھائی ہے اور یہ تیرا فرض ہے کہ اپنے آکا مرزا کو ہند کی حکومت حاصل کرنے میں مدد دے۔ تو سیدھا آگرے چلا جا اور ہمیں اہم خبریں بھیجتا رہ۔ اگر بابا جان نے ہمایوں کو تاج و تخت بخش بھی دیا تو ہم ان سے زبردستی حاصل کرنے کی تدبیر کریں گے۔ یہ حسین و جمیل لڑکی جس کا نام روشن جبیں ہے، تیرا انعام ہے۔ ویسے یہ ساری لڑکیاں تجھے انعام میں بخش دی جائیں گی لیکن ہم پہلے تیری صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں!"

اس کے بعد آکا مرزا پھر چلے گئے اور شاید خود انھوں نے روشن جبیں کو میرے کمرے میں بھیج دیا۔ یہ فتنہ ساماں اور سراپا قیامت میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر خود ہی آگے بڑھی اور مجھ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ پھر اس نے اور زیادہ جرأت سے کام لیا اور میرا داہنا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور ایک بار پھر دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ وہاں آکا مرزا کی ایک جھلک دکھائی دی۔ ان کے ہاتھ میں خنجر چمک رہا تھا اور اس خنجر کی نوک ہم دونوں کی طرف تھی۔ میں سہم گیا۔ میرا خیال تھا کہ روشن جبیں بھی ڈر کر مجھ سے دور ہٹ جائے گی لیکن اس کا آخری اقدام میری توقع کے سراسر خلاف نکلا۔ وہ مجھ سے چمٹ گئی، عنبری کی طرح، پورے جوش اور سرگرمی سے۔ بدخشی تاجر کے بقول، اس کی لمبی انگلیوں اور نرم و نازک لچکیلے ہاتھ کی خصوصیات اور صفات واضح انداز میں میرے سامنے تھیں۔ آکا مرزا کے خوف سے بے نیاز میری ذات میں سماتی چلی گئی۔ پھر میں بھی جذبات میں بہہ گیا اور روشن جبیں کی گداز اور لطیف آغوش میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے کچھ ایسا سرور اور کیف اپنی رگ و پے میں دوڑتا ہوا محسوس ہوا جس کے لطف اور لذت کو لفظوں میں



نہیں ظاہر کیا جا سکتا۔ جسم میں خون کی جگہ لطف و سرور کی لہریں دوڑ رہی تھیں انہی لہروں میں ایک معمولی اور حقیر سی ڈر کی لہر بھی دوڑتی محسوس ہوئی۔ آکا مرزا اور ان کے عریاں خنجر کے خوف کی لہر، مار دیئے جانے یا زخمی کر دیئے جانے کی دہشت کی لہر لیکن روشن جبیں کی آغوش اور گداز لمس کا سرور اس دہشت پر غالب آ گیا اور میں پرجوش روشن جبیں کے وجود میں تحلیل ہوتا چلا گیا۔ دونوں ہی ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔

کئی دن بعد میں آگرے روانہ ہو گیا۔ مجھے حیرت تو اس بات کی تھی کہ آکا مرزا نے روشن جبیں سے ہم آغوشی والے واقعے کا اشارتاً بھی ذکر نہ کیا اور یہ بات ایک مدت بعد میرے علم میں آئی کہ اس روز جو کچھ بھی ہوا تھا، وہ آکا مرزا کی خواہش اور حکم پر ہوا تھا۔ آکا مرزا نے روشن جبیں کو بے تکلف ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ اور اس حکم کی تعمیل کرانے کے لئے وہ برہنہ خنجر لیے دروازے پر موجود تھے اور شاید روشن اسی لئے گھوم گھوم کر دروازے کی طرف دیکھتی بھی رہی تھی۔ شاید اس عجیب و غریب طریقہ کار سے ان کا یہ مقصد تھا کہ پیاسے کے حلق میں چند قطرے ٹپکا کر اس کی تشنگی کی آگ کو تیزی کی طرح بھڑکا دیا جائے۔ کیونکہ اس آگ سے مشتعل ہو جانے کے بعد میں بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتا تھا اس توقع پر کہ اپنی مہم جوئی میں کامیابی کے بعد میں روشن جبیں کا حق دار ٹھہروں گا اور میرے حوالے کر دی جائے گی۔

چلتے وقت روشن جبیں نے ایک عجیب سی بات کہی تھی۔ اس نے دوپٹے کا آنچل سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا تھا "علی مرزا! میں بدخشاں کی رہنے والی ہوں جہاں کی حکومت، بادشاہ سلامت (بابر) نے ہمایوں کو عطا فرمائی ہے۔ تم حق اور انصاف سے روگردانی ہرگز نہ کرنا، چاہے اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔"

میں نے اس سے حق اور انصاف پر چلنے کا عہد بھی کر لیا تھا لیکن جب راستے میں اس کی ایک ایک بات پر غور کیا اور اس کے معانی و مطالب نکالنے لگا تو روشن جبیں کی مبہم بات میری سمجھ میں نہ آ سکی کیونکہ جہاں تک حق و انصاف کا تعلق تھا اس کی رو سے مجھے ہمایوں کا وفادار ہونا چاہیے تھا لیکن مجھ سے وفاداری کا مطالبہ آکا مرزا کر رہے تھے۔ بہرحال میں سخت الجھن میں پڑ گیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے ان چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ آکا مرزا نے میرے سپرد جو کام کیا ہے اسے انجام دے کر روشن جبیں کو حاصل کر لینا چاہیے اور پھر انعام میں آکا مرزا سے کوئی جاگیر لے کر رخصت ہو جانا چاہیے۔

اور پوری زندگی لطف و مسرت میں گزار دینا چاہیئے۔

میلوں دور سے آگرے کی بُو محسوس ہونے لگی۔ جمنا کے مشرقی کنارے پر حضرت بادشاہ بابر اپنے تعمیر کردہ باغ گل افشاں کی سرخ پتھروں سے فرشی ہوئی عمارت میں بستر علالت پر دراز تھے اور یہ محض اتفاق کی بات تھی کہ جب مجھے ان کے حضور پہنچایا گیا، ان کے گرد و پیش بڑے بڑے امرا جمع تھے۔ یہ امرا حضرت بادشاہ کی زندگی کے ہر موڑ پر نہایت وفادار ثابت ہوتے تھے۔ وہ شاہی تخت کے پیچھے ایک لمبے تخت جیسی کرسی پر دراز تھے اور ان کے قریب ہی شہزادہ ہمایوں دست بستہ کھڑا تھا۔ حضرت بادشاہ کو جب میری آمد کا علم ہوا تو انہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور مجھے اپنے قریب بلایا شفقت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے سہلانے لگے۔ پہلے آکا مرزا (مرزا کامران) کی خیریت پوچھی۔ پھر مرزا عسکری کی بابت متعدد سوالات کیے۔ انہوں نے ایک عظیم شہنشاہ کی شان سے کہا۔ "کاش ہماری تمام اولادیں اس وقت نظروں کے سامنے ہوتیں لیکن کوئی حرج نہیں، رب کی مرضی سب پر غالب ہے!"

حضرت بادشاہ نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور ہمایوں کا ہاتھ، ہاتھ میں لے کر اپنے امرا کو مخاطب کیا۔ "دوستو! یہ شہزادہ نصیر الدین ہمایوں ہمارا جانشین اور وارث تخت و تاج ہے۔ ہماری ذات سے وابستہ وفاداریاں اب تم سب اپنے نئے بادشاہ کی طرف منتقل کر دو۔" پھر ہمایوں کو حکم دیا کہ وہ تخت پر بیٹھ جائے۔ ہمایوں ہچکچاتا ہوا تخت پر جا بیٹھا۔ حضرت بادشاہ اور امرا نے ایک ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور قرآنی آیات پڑھ کر چپکے چپکے دعائیں دینے لگے۔ حضرت بادشاہ نے اپنے منہ پر دونوں ہاتھ پھیر کر ہمایوں سے کہا۔ "ہمایوں! اب تم اس مملکت کے شہنشاہ ہو اور تمہارا یہ فرض ہے کہ پوری توجہ سے خدا کی اطاعت اور بندگان خدا کی خدمت کرو، انصاف اور سچائی کو کبھی بھی ہاتھ سے نہ جانے دو، غریبوں اور بے آسرا لوگوں کو سہارا دو اور ہاں ایک اور خاص بات۔" یہ کہتے کہتے حضرت بادشاہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ معلوم نہیں کیا سوچنے لگے۔ پھر کہا۔ "ہاں دیکھو اپنے بھائیوں کے ساتھ مہربانی اور محبت سے پیش آنا، ان کا جرم کتنا ہی سنگین اور ناقابل معافی کیوں نہ ہو انہیں معاف کر دینا، غصے میں آ کر کبھی بھی ان کے خلاف کوئی سخت قدم ہرگز نہ اٹھانا!"

اشکبار ہمایوں نے حضرت بادشاہ کی اس نصیحت پر سختی سے عمل پیرا ہونے کا گلوگرفتہ آواز میں عہد کیا۔ اس کے بعد حضرت بادشاہ سوئے خلد بریں تشریف لے گئے۔





گل افشاں کے سرخ محل میں کہرام برپا ہو گیا۔ مغل امرا نے یہ مشورہ دیا کہ حضرت بادشاہ کی موت کو چھپایا جائے۔ چنانچہ کئی دن تک یہ خبر راز میں رہی لیکن ایک دن آراکش خان نامی ایک ہندی امیر نے ہمایوں سے بصیغہ راز داری و وفاداری مشورۃً عرض کیا کہ "حضرت بادشاہ مرحوم کی موت کی خبر چھپائے رکھنا اچھی بات نہیں ہے کیونکہ ماضی میں جب بھی ایسا کیا گیا شک و شبہے نے جڑ پکڑی اور بازار میں لوٹ مار شروع ہو گئی!"

ہمایوں نے فکرمندی سے دریافت کیا۔ "پھر ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟"

آراکش خان نے جواب دیا۔ "کسی شخص کو منادی کی خدمت سونپ کر سرخ لباس پہنایا جائے اور اسے ڈھول دے کر ہاتھی پر بٹھا دیا جائے۔ وہ شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں میں ڈھول پیٹ پیٹ کر اعلان کر دے کہ اعلیٰ حضرت بادشاہ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اور درویش بن کر بادشاہت ہمایوں کو سونپ دی ہے!"

ہمایوں نے اس تجویز پر عمل کیا اور لوگوں کے شکوک کو رفع دفع کر دیا۔ حضرت بادشاہ مرحوم کی لاش ایک تابوت میں امانتاً رکھ دی گئی کیونکہ مرحوم بادشاہ کی وصیت کے مطابق اسے کابل میں دفن ہونا تھا۔

میں نے یہ ساری روداد بالتفصیل لکھ کر آکا مرزا کو روانہ کر دی۔ میرے ساتھ ہمایوں کا سلوک بہت اچھا تھا اور وہ آکا مرزا اور عسکری مرزا کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتا تھا۔ مجھے ہمایوں دن بدن جیسی نیک نفسی اور شرافت نظر آئی؟ اس کے پیش نظر میں نے آکا مرزا کو یقین دلایا کہ اگر وہ ذرا سی ہمت سے کام لے تو ہندوستان کا تخت و تاج اس کے قدموں میں ہو گا۔

آکا مرزا نے مجھے لکھا کہ "تم ہمایوں کے آس پاس موجود رہو اور اس کی ہر بات پر نظر رکھو اور مجھے آگرے سے پہنچایا سمجھو۔"

اسی دوران گجرات کے حکمران سلطان بہادر نے سرکشی اختیار کی اور ہمایوں اس کی سرکوبی کو آگرے سے باہر نکلا۔ میں نے آکا مرزا کو نئی صورت حال سے مطلع کیا اور مشورہ دیا کہ ہمایوں کی عدم موجودگی آگرہ سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین موقع ہے۔ دو شن جبیں کی یاد تجھے بیٹھے، سوتے جاگتے ستاتی رہتی تھی اور اس نے مجھے یہاں تک ستایا کہ میں نے خط کے آخر میں آکا مرزا سے درخواست کی کہ "روشن جبیں اس ناچیز کی آپ کے پاس امانت ہے۔ آپ کی عاید کردہ شرط کی تکمیل میں معلوم نہیں کتنا وقت لگے گا اس لئے کیا یہ بات جائز اور مناسب نہیں ہے کہ روشن جبیں کی ایک تصویر کسی ماہر مصور سے بنوا کر اس ناچیز

کو روانہ کردی جائے!"

آکا مرزا نے میری درخواست پوری کردی، روشن جبیں کی تصویر نے میرے اشتیاق و اضطراب میں اور زیادہ آگ لگا دی۔ میں تنہائی میں اس تصویر کو سینے سے لگا کر، دیوانوں جیسی باتیں کرتا رہتا۔ گو یہ ایک سنجیدہ تصویر تھی لیکن مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مسکرا رہی ہو۔

ہمایوں نے سلطان بہادر کے تعاقب اور مقابلے میں سینکڑوں میل کا سفر کر ڈالا اور اسے شکستِ فاش دے کر گجرات کی حکومت مرزا عسکری کے حوالے کردی۔ مرزا عسکری اور مرزا کامران ایک ماں کے بیٹے تھے۔ ہمایوں آگرے واپس آیا۔ آکا مرزا ابھی تک حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ پھر ہمایوں افغان باغی شیر خان سوری سے الجھ گیا کیونکہ شیر خان کے عزائم بہت ہی خطرناک محسوس ہو رہے تھے۔ اس موقع پر میں نے آکا مرزا کو زور دے کر لکھا کہ اب اس سے بہتر موقع شاید کبھی بھی نہ آئے ہمت کرکے آگے بڑھئے اور آگرے پر قبضہ کرکے ہمایوں کو جلاوطن کر دیجئے۔"

مجھے اس بات کا ذرا بھی علم نہ تھا کہ چند جاسوس اور چغل خور میرے کردار اور افعال کی نگرانی کر رہے ہیں۔ چنانچہ اس غفلت اور لاعلمی کا یہ نتیجہ نکلا کہ میرا آخری خط پکڑا گیا اور مجھے خط سمیت ہمایوں کے سامنے پیش کر دیا گیا۔

ہمایوں نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا یہ تیری تحریر ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہمایوں نے سختی سے پوچھا۔ "مرزا کامران کیا چاہتا ہے؟"

میں نے سادہ لوحی سے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت کی قربت اور حضوری۔"

ہمایوں نے غصے میں کہا۔ "دہلی اور آگرے پر قبضے کی ترغیب دیتے ہو اور ہمیں جلاوطن کر دینے کا مشورہ دے رہے ہو اور جب تمہاری سازش پکڑی گئی تو یہ کہتے ہو کہ مرزا کامران ہماری قربت اور حضوری کا خواستگار ہے۔"

میں نے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! اس ناچیز نے وہی کچھ لکھا ہے جو حضور والا نے پڑھا ہے لیکن اس کا وہ مفہوم ہرگز نہیں ہے جس کا بظاہر اظہار ہوتا ہے۔ حضور والا نہیں جانتے کہ آکا مرزا کے مشیر کیسے ہیں ____؟ وہ آکا مرزا کو ہر وقت اس پر آمادہ کرتے رہتے ہیں کہ وہ آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں اور آپ کو آگرے اور دہلی سے نکال باہر کریں۔ میری معترضہ عبارت میں در پردہ آکا مرزا کے لئے یہ پیغام ہے کہ وہ دہلی اور آگرے کی طرف بڑھیں اور آپ سے مل کر حاسد اور شریر امرا کو جلاوطن کر دیں تاکہ





وہ بھائیوں کے درمیان اختلافات اور مناقشات کی خلیج نہ حائل کر سکیں!"

ہمایوں میرے اس جواب سے کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔

اسی دوران یہ پتہ چلا کہ مرزا عسکری نے احمد آباد میں سرکشی اختیار کی اور اپنے نام کا خطبہ پڑھوانے کی فکر میں ہے۔ ہمایوں کو اس خبر سے بڑا دکھ پہنچا اور جواب دہی کے لئے عسکری مرزا کو طلب کیا۔ ادھر شیر خان کو بھائیوں کے اختلافات کی رتی رتی خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ اس کوشش میں تھا کہ یہ اختلافات کم نہ ہوں، بڑھتے ہی رہیں۔ آکا مرزا نے مجھے اپنے خط میں لکھا تھا کہ "شیر خان سے کسی بھی طرح خفیہ طور پر ملو اور اسے جنگ جاری رکھنے کا مشورہ دو۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ ہمایوں کے ایک طاقتور حریف کی ہمیں حمایت حاصل ہو جائے گی۔"

اتفاق کی بات کہ یہ خط بھی پکڑا گیا اور ہمایوں نے مجھ سے پھر جواب طلب کیا۔ اس بار بھی میں نے بات بنانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ ہمایوں میری بات سے مطمئن نہ ہوا بولا۔ "مرزا کامران ہمارا بھائی ہے اور تم اس کے دودھ شریک بھائی ہو۔ اس رشتے سے تم ہمارے بھائی بھی ٹھیرے، کیا تمہارا یہ فرض نہیں ہے کہ تم اگر ہم بھائیوں میں کسی قسم کے اختلافات محسوس بھی کر رہے ہو تو انہیں اپنے ذاتی اثر و رسوخ اور فکر و تدبیر سے دور کرو، چہ جائیکہ ہمیں آپس میں لڑانے کی کوشش کر رہے ہو۔"

میں ہمایوں کی بات سے بہت متاثر ہوا اور تذبذب میں مبتلا ہو گیا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے؟ آکا مرزا کے لئے جاسوسی یا شریف النفس ہمایوں کے لئے آپس میں اتحاد و یگانگت کی کوشش؟ ابھی میں اسی فکر و تردد میں تھا کہ ہمایوں کی فوج میں یہ افواہ گرم ہوئی کہ مرزا ہندال (ہمایوں کا ایک اور بھائی) ہمایوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر آگرے کا بادشاہ بن بیٹھا ہے اور خطبے میں اپنا نام پڑھوا کر دہلی کی طرف بڑھنے والا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی سننے میں آیا کہ آکا مرزا لشکر جرار کے ساتھ دہلی کی طرف چل پڑا ہے اور غالباً مرزا ہندال اور آکا مرزا میں جنگ و جدال برپا ہونے والی ہے۔"

مجھے آکا مرزا کی یلغار سے خوشی ہوئی اور بالکل ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا نے آگرے اور دہلی پر قبضہ کرکے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا ہے اور جمعے کی نمازوں کے خطبے میں آکا مرزا کا نام پڑھا جانے لگا ہے۔ اس خوش فہمی اور فضول احساس نے ذرا کا دیر کے لئے مجھے غافل اور لاپروا بنا دیا۔ میں اپنے خیمے میں چلا گیا اور روشن جبیں

کی تصویر سامنے رکھ کر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے تصویر سے کہا۔ "روشن جبیں! اب وہ دن دور نہیں کہ میں تمہیں حاصل کر چکا ہوں گا، تم نہیں جانتیں کہ تمہاری مفارقت نے مجھے نیم جان کر رکھا ہے۔"

عین اس وقت جب میں تصویر کو بوسہ دے کر سینے سے لگائے ہوئے تھا، ایک سپاہی نے میری چوری پکڑ لی اور نہایت پھرتی سے روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھین لی۔ اس کی اس حرکت پر مجھے غصہ آ گیا اور میں نے تصویر کی واپسی کے لئے اس پر بھرپور حملہ کر دیا۔ میں نے اچھل کر اپنی ٹانگوں سے اس کے سینے پر ایک ضرب لگائی لیکن اس نے وار خالی کر دیا اور میں اپنے زور میں آپ ہی ڈھیر ہو گیا۔ میرے گرتے ہی وہ میرے سینے پر سوار ہو گیا اور چیخنے لگا۔ "لوگو! دوڑنا، میں نے اس کی ایک ایسی چوری پکڑی ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔"

ذرا سی دیر میں بہت سارے آدمی میرے خیمے میں داخل ہو گئے، مجھے چت اور اس سپاہی کو میرے سینے پر سوار جو دیکھا تو ہنسنے لگے، کسی نے پوچھا۔ "یہ وہی شخص ہے نا جس نے مرزا کامران کے لئے جاسوسی کی خدمات انجام دی ہیں؟"

کسی نے جواب دیا۔ "ہاں یہ وہی ہے!"

کسی نے پوچھا۔ "کیا پھر کوئی خط پتر پکڑا گیا؟"

میں نے جواب دینا چاہا لیکن میرے حریف نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تفصیل میں بتاؤں گا تو خاموش رہ!"

اتنے میں شور و غل کی آواز سن کر ہمایوں بھی میرے خیمے میں داخل ہوا، میرے حریف نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک طرف مؤدبانہ کھڑا ہو گیا۔

ہمایوں نے نرمی سے پوچھا۔ "کیا بات تھی؟ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے تھے۔؟"

میرے حریف نے ادب سے جھک کر عرض کیا۔ "حضور والا! یہ شخص ہمیں مسلمان معلوم نہیں ہوتا۔ یہ تصویر پرست ہے میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس تصویر پر اس شخص کو سجدہ کرتے دیکھا ہے!"

ہمایوں نہایت غور سے روشن جبیں کی تصویر دیکھتا رہا۔ پھر بے دلی سے پوچھا۔ "علی مرزا! تم پر جو الزام لگایا گیا کیا یہ درست ہے؟"

میں نے آبدیدہ ہو کر جواب دیا۔ "یہ اس ناچیز پر سراسر بہتان ہے، خاکسار





مسلمان ہے اور ایک مسلمان تصویر پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے؟"

ہمایوں نے پوچھا۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"

میں نے شرما کر جواب دیا۔ "ناچیز کی منگیتر کی!"

ہمایوں نے طنزیہ کہا۔ "اسے سینے سے لگائے کیوں پھر رہے ہو؟"

اس سوال کا میں کوئی جواب نہ دے سکا۔

ہمایوں نے تصویر میرے حریف کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا۔ "آگرے پہنچنے پر یہ مقدمہ ہمارے سامنے پیش کیا جائے وہاں اگر یہ ثابت ہو گیا کہ تم تصویر پرستی کے گناہ کے مرتکب ہو چکے ہو تو تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی!"

میں سہم گیا، خوف کے ساتھ ہی یہ قلق مجھے اور زیادہ پریشان کرنے لگا کہ روشن جبیں کی تصویر مجھ سے چھن گئی تھی۔ اب میں یہ تصویر لڑ جھگڑ کر بھی واپس نہ لے سکتا تھا۔

بھائیوں کی سرکشی اور باغیانہ روش نے ہمایوں کو بددل اور فکر مند کر دیا تھا اسی وجہ سے وہ زیادہ سپاہ رکھنے کے باوجود شیر خان کے مقابلے میں کمزور پڑ رہا تھا۔ اس نازک موقع پر ہمایوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال شیر خان سے نہ الجھا جائے اور اس سے صلح کر کے آگرے واپس جا کر پہلے بھائیوں کی سرکشی کا خاتمہ کیا جائے۔ یہ سوچ کر اس نے ملا محمد عزیز نامی ایک امیر کو طلب کیا۔ ملا عزیز کے شیر خان سے یارانہ تعلقات رہ چکے تھے اس موقع پر معلوم نہیں کیوں، ہمایوں کو میری یاد آ گئی اور اس نے مجھے تخلیے میں طلب کیا۔ "علی مرزا! شاید تو جاسوسی کے کام میں خاص مہارت رکھتا ہے یہ بہترین موقع ہے کہ تو ملا عزیز کے ساتھ شیر خان کے پاس جائے اور ان دونوں میں جو بات چیت ہو لفظاً ہمارے گوش گزار کرے۔"

میں نے شکریے کے ساتھ بادشاہ کی خدمت قبول کی۔

اسی وقت بادشاہ نے میرے حریف کو طلب کیا اور خلاف توقع اسے حکم دیا کہ روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی جائے۔ میرا حریف حیرت زدگی اور ناگواری کے آثار لئے واپس آ گیا۔ ہمایوں کے اس حکم نے مجھے خود بھی حیران کر دیا تھا۔ غالباً بادشاہ نے میرے احساسات کا اندازہ لگا لیا کہنے لگے۔ "علی مرزا! تم ایک ہوش مند لیکن

عاشق مزاج نوجوان ہو، ہمارا خیال ہے کہ تمہیں کامران مرزا نے حسین لڑکیوں کا لالچ دے کر اس ناپسندیدہ کام پر آمادہ کیا ہوگا۔ کیا تمہیں رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کا علم نہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ دوسروں کی جستجو مت کرو۔"

شاید مجھے پہلی بار بادشاہ کی ذہانت اور فراست کا دل کی گہرائیوں سے قائل ہونا پڑا۔

اس گفتگو کے بعد ہمایوں نے نرمی سے کہا: "کل جب ہمیں تمہاری تصویر پرستی کا علم ہوا تھا تو ہم واقعی مشتعل ہو گئے تھے لیکن دیر بعد تنہائی میں جب اس مسئلہ پر غور کیا تو شرمندہ ہو گئے۔ جوانی میں کون ہے جو عشق و محبت میں مبتلا نہیں ہوتا۔ تم اس لڑکی سے محبت کرتے ہو تو ضرور کرو لیکن آئندہ اس کی تصویر کو سجدہ ہرگز نہ کرنا۔"

میں نے جلد ہی جلدی عرض کیا: "اعلیٰ حضرت کو غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اس ناچیز نے تصویر کو سجدہ کیا تھا۔ ایک مسلمان بت پرستی کا کس طرح مرتکب ہو سکتا ہے۔"

اعلیٰ حضرت نے مزید فرمایا: "علی مرزا ہمیں افیون کھانے کی عادت ہے، کبھی کبھی اثر غالب آ جاتا ہے۔"

بادشاہ کی صاف گوئی اس کی صدق دلی کی گواہی دے رہی تھی۔

میرے حریف نے روشن جبیں کی تصویر میرے حوالے کر دی۔ یہاں میں اپنے ان احساساتِ مسرت کو کس طرح اظہار کروں جو روشن جبیں کی تصویر پا کر مجھ پر طاری ہوئے تھے۔ میں نے بادشاہ سے نظریں بچا کر نہایت احتیاط اور لاپرواہی سے روشن جبیں کی تصویر پر شوق بھری نظر ڈالی اور اسے اپنی عبا میں چھپا لیا۔

جب میں ملا عزیز کے ساتھ شیر خان کے لشکر میں داخل ہوا تو اس کے سپاہی ہمیں ایک کھدی ہوئی خندق کے پاس لے گئے۔ اس چلچلاتی دھوپ میں شیر خان اپنے بہت سارے سپاہیوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھا۔ اس کا چہرہ اور داڑھی مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے کدال فضا میں بلند کی اور زور سے کھدی ہوئی خندق کے کنارے پیوست کر دی۔ مٹی کا ایک بڑا سا ٹکڑا غبار سا اڑاتا ہوا خندق میں گر گیا۔ اسی عالم میں اسے ہماری اطلاع دی گئی وہ خندق سے باہر نکلا اور کدال ایک طرف رکھ کر سپاہیوں کو حکم دیا کہ ہمارے لئے وہیں ایک چھوٹا سا خیمہ نصب کیا جائے





اس حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور شیر خان اپنا منہ اور ہاتھ دھونے لگا۔

پھر ہم سب اس نئے خیمے میں اکٹھے ہو کر بیٹھے اور ملا عزیز نے نہایت وقار سے شیر خان سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ شیر خان بلا کا ذہین تھا وہ بات کی تہہ تک پہنچ گیا۔ وہ ہمایوں کے بھائیوں کی سرکشی سے خوب واقف تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ ہمایوں کی نرم قیادت مغل فوج میں اتحاد اور جوش و خروش پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ اس نے خوش اخلاقی سے جواب دیا: "ملا عزیز! آپ ہماری طرف سے ہمایوں سے یہ عرض کر دیں کہ ہم دونوں بڑی مشکل میں پھنس گئے ہیں۔ ہم خود بادشاہ سے نہیں لڑنا چاہتے لیکن ہمارا لشکر جنگ پر مصر ہے، اسی طرح ہمایوں خود ہم سے جنگ کرنا چاہتا ہے لیکن اس کا لشکر جنگ پر آمادہ نہیں۔"

شیر خان کے جواب نے ہمیں صلح کی طرف سے مایوس کر دیا۔ اس وقت وہ زمین پر بے تکلف بیٹھا ہوا تھا اور شیر خان کی ہر بات اور جس طور طریق ہمیں بتا رہے تھے کہ بھائیوں کی نا اتفاقی اور فوج کی بد دلی کا شکار ہمایوں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہم ہمایوں کے پاس واپس گئے اور شیر خان کے جواب سے مطلع کر دیا۔

دوسرے دن صبح شیر خان کی فوج ہماری طرف بڑھی اس کا ایک جنگجو ہاتھی ہمایوں کے لشکر کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ ہمایوں نے عجلت میں طبل جنگ بجوایا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کے ہاتھی کے آگے بڑھا۔ ہمایوں کا نامی جنگجو میرزا بیگ اور اس کے دونوں بھانجے بیٹے سامنے موجود تھے ہمایوں نے انہیں حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ لیکن یہ تینوں بسبب شرم کے گردن جھکا کر کنارے ہٹ گئے۔ ہمایوں نے میرزا بیگ کے ایک بیٹے کے ہاتھ سے نیزہ چھین لیا اور دشمن کے ہاتھی کی پیشانی میں مار دیا۔ دفعتہً ہاتھی کی عماری سے ایک تیر آ کر ہمایوں کے ہاتھ میں پیوست ہو گیا۔ ہمایوں نے اُف تک نہ کی اور پیوستہ تیر کی پرواہ کئے بغیر، ہاتھی کی پیشانی سے نیزہ نکالنے کی کوشش کرتا رہا اور جب انتہائی زور آزمائی کے باوجود نہ نکال سکا تو وہاں سے بھاگ کر اپنے لشکر میں آیا اور [illegible] کر حملے کا حکم دیا۔ لیکن عالم یہ تھا کہ افغانی مغل لشکر کو زیر و زبر کرنے میں مصروف تھے اور مغل سپاہ چوہوں کی طرح بل کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔ خود میرا یہ عالم تھا کہ بدحواسی میں فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آ رہی تھی میں گھبرا کر بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اور یکبارگی میرے جی میں آئی کہ اس بے سروسامانی میں تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ ہمایوں کی گردن پر رسید کر دوں تاکہ آکا مرزا کی راہ کا سب سے بڑا کانٹا دور ہو

جائے لیکن معلوم نہیں وہ کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اس ارادے سے باز رکھا۔ لوگ کہتے ہیں بادشاہوں پر سات ولیوں کا سایہ ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس خطرناک موقع پر کسی ولی کا سایہ محیط ہو جس سے وہ میرے حملے اور انتقام سے محفوظ رہا۔ میں نے آگے بڑھ کر بادشاہ کی عنان پکڑ لی اور خوشامدانہ عرض کیا: "اعلیٰ حضرت اب کیوں ٹھہرے ہیں، مغل سپاہ زیر و زبر ہو چکی، یہ وقت ٹھہرنے کا نہیں، فرار ہو جانے کا ہے۔ آپ یہاں کس توقع اور کس کے سہارے پر نبرد آزما ہیں؟"

ہمایوں نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا اور گھوڑے کو دوڑا کر دریا کے کنارے پہنچا۔ وہاں بادشاہ سوا گرد باز نامی ہاتھی پہلے سے موجود تھا۔ بادشاہ نے مہابت کو حکم دیا کہ ہاتھی اس کے قریب لایا جائے مگر مہابت نے کوئی پروا نہ کی اور بہروں کی طرح بادشاہ کی بات سنی ان سنی کر دی۔ بادشاہ نے مجبوراً گھوڑے کو دریا میں ڈال دیا۔ ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ بادشاہ کا گھوڑا اس کی ران سے نکل گیا اور بادشاہ ڈبکیاں کھانے لگا۔ اسی عالم میں، میں اس کی مدد کو بڑھا لیکن مجھ سے پہلے نظام نامی ایک سقہ مشک پھلا کر بادشاہ کی طرف بڑھا اور مشک کی مدد سے بادشاہ کو دوسرے کنارے پر پہنچا دیا۔

کنارے پہنچ کر بادشاہ نے سقے سے پوچھا: "تمھارا نام؟"

سقے نے جواب دیا: "نظام دین"

ہمایوں سر سے پیر تک اُسے دیکھتا رہا، پھر کہا: "تم ہمارے ساتھ آگرے چلو، ہم اس عظیم خدمت کے صلے میں تمھیں دو دن ہندوستان پر حکومت کرنے کا موقع دیں گے۔"

بادشاہ میری وفاداری سے بہت متاثر تھا۔ راہ میں اس نے نظام سقہ کی بابت اپنے ایک عجیب شبہے کا اظہار کیا۔ اس نے مجھ سے کہا: "علی مرزا! کیا تمھیں اس بات کا یقین ہے کہ نظام الدین واقعی ایک سقہ ہے؟"

میں نے تردد سے عرض کیا۔ "اعلیٰ حضرت روشن ضمیر ہیں یہ ناچیز کیا عرض کر سکتا ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا: "ہمارا خیال ہے یہ حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاءؒ تھے جو ہماری دستگیری فرمانے آئے تھے۔"

مجھے ہمایوں کی اس خوش عقیدگی پر حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی کیونکہ



جب مایوسیاں حد سے زیادہ غلبہ کرتی ہیں تو آدمی کو معجزات اور کرامات ہی سہارا دیتے ہیں۔

اس سفر میں مجھے ایک اور تجربہ بھی ہوا۔ بادشاہ جب کالپی سے گزرا تو وہاں کے حکمران کا بیٹا نذرانے لے کر حاضر ہوا۔ ان نذرانوں کی بابت بادشاہ کو یہ اطلاع ملی تھی کہ نذرانے تو بہت زیادہ تھے لیکن جب بادشاہ کی شکست کا اُسے علم ہوا تو اس نے نذرانوں کی مقدار کم کر دی اور بادشاہ کی سرسری توقیر کی۔ بادشاہ کو اس خبر سے صدمہ پہنچا۔ اُس نے شکریے کے ساتھ نذرانے واپس کر دیے اور آگرے روانہ ہو گیا۔

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آگرے میں کامران مرزا بادشاہ بننے کی فکر میں اوقات گزیں ہیں۔ میں نے تصور کی آنکھوں سے دونوں بھائیوں کو آپس میں دست بگریباں دیکھا اور پھر یہ بھی دیکھا کہ کامران مرزا اور ہمایوں میں سے کسی ایک کا لاشہ زمین پر تڑپ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ لاشہ بدقسمتی سے کامران مرزا کا نکلا تو میرا کیا حشر ہوگا۔ روشن جبیں کو کس طرح حاصل کروں گا۔ درباری اُمرا جو میرے مخالف ہیں اور حاسد ہیں میرا کیا حشر کریں گے۔ یہ اندیشے مجھے پریشان کرنے لگے۔

ہمایوں نے آگرے پہنچنے سے پہلے مجھے ایک نصیحت کی۔ کہا: "علی مرزا! تم ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا جب دو بھائیوں میں رنجش ہو تو ان بھائیوں کے دوستوں اور محبوں کو غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ایک زبردست خطرہ موجود رہتا ہے۔"

میں بادشاہ سے آنکھ ملانے کی ہمت تو نہ رکھتا تھا لیکن جس طرح سکوت اختیار کیا اس میں بادشاہ کی بقیہ بات سننے کا اشتیاق پایا جاتا تھا۔ بادشاہ نے غالباً مجھ پر ایک سرسری نظر ڈالی اور بات پوری کر دی۔ کہا: "دو ناراض بھائی کسی وقت بھی ایک ہو سکتے ہیں اور جب بھی ایک ہوں گے۔ نفاق پھیلانے والے دوستوں کی شامت آجائے گی۔"

یہ بادشاہ کا اشارہ میری طرف تھا۔ بات قیمتی تھی میں نے گرہ میں باندھ لی اور یہ فیصلہ کیا کہ کچھ بھی ہو آگرے پہنچ کر کامران کی اس خطرناک خدمت سے سبکدوشی حاصل کرنے کی کوشش ضرور کروں گا۔



آکا مرزا باغ گلفشاں کے سرخ محل کے ہرے پردے میں غافل بیٹھے تھے کہ

بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ وہاں پہنچ گیا، بادشاہ کے گھوڑے نے زور سے اپنے پاؤں پٹکے، محل کے خدام بدحواسی میں بادشاہ کی طرف دوڑ پڑے اور بادشاہ کی رکاب پکڑی ابھی ہمایوں گھوڑے سے اترا بھی نہ تھا کہ میرا پردے سے آکا مرزا بدحواسی میں نکلا اور بادشاہ کے پاؤں چومنے لگا۔ ہمایوں گرتے گرتے بچا، گھوڑے سے اتر کر آکا مرزا کو سینے سے لگا لیا اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیا۔ میں ہمایوں کی پشت پر کھڑا تھا۔ آکا مرزا کا ہم آغوش سر ہمایوں کے کاندھے پر رکھا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں مجھے گھور رہی تھیں۔ میں نے نظریں جھکا لیں۔

آکا مرزا اور ہندال مرزا نے جرم یکساں کیے تھے۔ لیکن ان دونوں میں فرق اتنا تھا کہ ہندال مرزا بادشاہ کی آمد کی خبر سن کر فرار ہو گیا تھا اور آکا مرزا نے حالات کا حوصلہ مندی سے مقابلہ کیا تھا۔ اس موقع پر آکا مرزا نے جس غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا اس نے مجھے چونکا دیا۔ آکا مرزا نے ہندال مرزا کی سفارش کر کے خود کو بچا لیا۔ کہا۔ "حضرت سلامت ہندال مرزا نادان اور ناسمجھ ہے اس ناچیز کی خواہش ہے کہ حضور والا اسے معاف فرما دیں۔"

صاف دل ہمایوں نے جواب دیا۔ "ہم ہندال مرزا کی لغزش تمہاری وجہ سے معاف کرتے ہیں اسے بلواؤ اور نصیحتیں کرو کہ آئندہ ان گستاخیوں کا مرتکب نہ ہو۔"



اس کے بعد بادشاہ نے نظام سقہ کا آکا مرزا سے تعارف کرایا اور کہا کہ "ہم نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ اسے دو دن حکومت کرنے کی سعادت عطا کریں گے!"

آکا مرزا نے ناگواری سے منہ بنایا' زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔

ہمایوں بہت تھکا ہوا تھا وہ آرام کرنے محل میں چلا گیا تو آکا مرزا مجھے محل کے ایک گوشے میں لے گیا۔

موتیا کی خوشبو سے فضا معطر تھی۔ دوسرے پھولوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن اس خوشبو میں ترشی، معلوم نہیں کیوں پائی جاتی تھی جس کمرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے اس میں مرصع و منقش چاندی کا خطب (شمع دان) سر پر لٹکا ہوا بارہ شمعوں کی روشنی دے رہا تھا۔

آکا مرزا نے پہلے تو مجھ سے شیر خان سے جنگ اور ناکامی کی تفصیلات سنیں، پھر پوچھا۔ "کیا یہ درست ہے کہ اعلیٰ حضرت ہمایوں نے ہمارے خطوط پکڑ لیے تھے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

آکا مرزا بے چین ہو کر کھڑے ہو گئے، پھر پوچھا۔ "پھر؟ پھر کیا ہوا؟ حضرت سلامت نے کیا فرمایا؟"

میں نے جواب دیا۔ "انہوں نے حیرت انگیز درگزر سے کام لیا!"

"افسوس!" آکا مرزا ٹھنڈی سانس بھر کر بولے۔ تم اگر ذرا سی ہمت اور ہوشیاری سے کام لیتے تو آج ہندوستان کے تخت و تاج پر ہمارا قبضہ ہوتا لیکن تم بزدل اور بے وقوف نکلے!"

میرا خیال تھا آکا مرزا میری خدمات کو سراہیں گے لیکن جب وہ الٹی آنکھیں دکھانے لگے تو مجھے بڑا غصہ آیا۔

آکا مرزا نے کہا۔ "کسی کو بڑا منصب یوں ہی نہیں ملتا، اس کے لئے بہت تدبر اور بہادری کی ضرورت ہوتی ہے، اول تو تم نے نااہلی اور نااتفاقی سے خطوط پکڑوا دیے دوسرے یہ کہ جب شکست کی افراتفری میں تمہیں اعلیٰ حضرت کو قتل کر دینے کا موقع ملا تو تم نے کوتاہی اور غفلت سے کام لیا' جب حضرت سلامت دریا میں ڈبکیاں کھا رہے تھے اگر تم ذرا سی ہوشمندی اور ہمت سے کام لیتے تو وہ کبھی بھی پانی کی سطح پر نمودار نہ ہوتے اور آج ہندوستان کا تخت و تاج ہمارے قبضے میں ہوتا!"

میں نے رک رک کر جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت حد درجہ شریف انسان ہیں پھر یہ

بھی سننے میں آیا ہے کہ بادشاہوں پر سات دلیوں کا سایہ ہوتا ہے اعلاحضرت بھی بادشاہ ہیں اور شاید انہیں بھی سات دلیوں کا سایہ حاصل ہے پھر میں انہیں کس طرح ہلاک کر سکتا تھا!"

آکا مرزا نے غصے میں میرے رخسار پر ایک طمانچہ جڑ دیا۔ طمانچے کی آواز کے ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور اعلاحضرت خلاف توقع اندر داخل ہوتے۔ میں اپنا رخسار سہلانے لگا۔ آکا مرزا گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

اعلاحضرت نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں دریافت فرمایا۔ "یہ آواز کیسی آئی تھی؟"

آکا مرزا سے پہلے میں نے جواب دیا۔ "حضور والا! ایک مچھر دیر سے تنگ کر رہا تھا، وہ بار بار میرے رخسار پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تنگ آ کر میں نے مچھر کو مارنے کے لئے اپنے رخسار پر طمانچہ رسید کر لیا۔"

بادشاہ نے غور سے ہم دونوں کو یکے بعد دیگرے دیکھا اور ایک طویل ہنکاری بھری۔

آکا مرزا کی آنکھوں میں ممنونیت کا جذبہ سمٹ آیا۔

بادشاہ کے ہاتھ میں کاغذات کا پلندا دبا ہوا تھا۔ انہوں نے اچانک مجھ سے دریافت فرمایا۔ "علی مرزا! وہ لڑکی والی تصویر کہاں ہے؟"

میں شرم سے جواب نہ دے سکا۔

انہوں نے پھر سوال کیا۔ "تم جواب کیوں نہیں دیتے؟"

آکا مرزا نے پوچھا۔ "اعلاحضرت کس تصویر کی بابت سوال فرما رہے ہیں؟"

بادشاہ نے نہایت سادگی اور بھولپن سے پوری تفصیل بتا دی اور کہا۔ "کامران مرزا! تمہارا یہ کوکہ (دودھ شریک) بڑا عاشق مزاج نوجوان ہے۔" پھر پوچھا۔ "کامران مرزا! کیا وہ لڑکی تمہارے ساتھ آئی ہے؟"

آکا مرزا نے فدویت سے جواب دیا۔ "کیوں؟ کیا اعلاحضرت کو یہ لڑکی پسند ہے؟"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "کون ہے جو اسے ایک نظر دیکھ لینے کے بعد پسند نہیں کرے گا۔"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت جب آرام فرما کر اٹھیں گے روشن جبیں





خدمت اقدس میں پیش کر دی جائے گی۔!"

میرے دل پر ایک گھونسا لگا اور مجھے بادشاہ سے زیادہ آکا مرزا پر غصہ آیا جو یہ کہہ سکتے تھے کہ روشن جبیں کسی کی امانت ہے اعلاحضرت اس کا خیال دل سے نکال دیں لیکن آکا مرزا تو الٹے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

بادشاہ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف رہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ "کامران مرزا! کیا تمہیں نہیں معلوم کہ شیر خان افغان ہم سب کے لئے خطرہ بن چکا ہے اور ہم سب کے لئے اس وقت یہ ضروری ہے کہ آپس کی نا اتفاقیاں ختم کر کے مل جل کر رہیں!"

آکا مرزا نے بے شرمی اور ڈھٹائی سے کہا۔ "اعلاحضرت! یہ تو جانتے ہیں کہ ہم تابعدار لوگ حضور والا کے نمک خوار اور پروردہ ہیں، جیسا حکم دیں گے اس پر عمل کیا جائے گا۔"

بادشاہ نے کہا۔ "کامران! ہم یہ چاہتے ہیں کہ پہلے شیر خان سے مقابلہ ہونا چاہیے!"

پھر مجھ سے کہا۔ "علی مرزا تیری وفاداری سے ہمارے دل پر بڑا اثر ہوا حالات اعتدال پر آ جائیں پھر تجھے تیری خدمات کا خاطر خواہ انعام دیا جائے گا۔"

آکا مرزا بادشاہ کی باتوں سے دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے۔

بادشاہ نے کچھ یاد کرتے ہوئے کہا۔ "کامران مرزا! کیا تم یہ عہد کرنے کو تیار ہو کہ تم آئندہ سرکشی اور بغاوت نہیں کرو گے!"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "اعلاحضرت کو کسی قسم کی غلط فہمی ہو گئی ہے ورنہ یہ خاکسار اتنی بڑی جرأت کس طرح کر سکتا ہے!"

بادشاہ نے ہاتھ میں دبے ہوئے کاغذات کا پلندا میز پر رکھ دیا اور واپس جاتے ہوئے فرمایا۔ "ہم کل تمہیں باریابی کا شرف بخشیں گے اس وقت تم سے ہم بعض اہم مشورے کریں گے!"

بادشاہ کے جاتے ہی آکا مرزا نے ان کاغذات پر قبضہ کر لیا اور انہیں کھول کھول کر دیکھنا شروع کیا، اچانک آکا مرزا کا چہرہ سفید پڑ گیا میں نے ان تمام کاغذات کو سرسری نظر سے دیکھا یہ آکا مرزا کے وہ خطوط تھے جو انہوں نے مجھے اور بعض دوسرے لوگوں کے نام لکھے تھے انہیں میں چند وہ خطوط بھی موجود تھے جن میں بادشاہ سلامت

کو قتل کر دینے کا حکم دیا گیا تھا۔ آقا مرزا لرز گئے۔ وہ بادشاہ کی ایما سمجھ چکے تھے۔ ہمایوں نے اس طرح آقا مرزا کو یہ بات بتا دی تھی کہ وہ جو کچھ بھی اس کے خلاف کر رہے ہیں بادشاہ اس سے باخبر ہیں۔

آقا مرزا کمرے سے نکل گئے لیکن پانچ منٹ بعد پھر واپس آ گئے بولے: "علی مرزا! ہم یہ دیکھنے باہر گئے تھے کہ وہاں اعلیٰ حضرت موجود تو نہیں، لیکن شاید وہ سونے کے لیے خواب گاہ میں جا چکے ہیں۔"

میں نے پوچھا: "بادشاہ کو ہماری مصروفیات کا پورا علم ہے اس باب میں آپ کا کیا خیال ہے کیا بادشاہ ہمیں ان باغیانہ خطوط کی سزا میں قتل نہیں کرا دیں گے؟"

آقا مرزا نے افسردگی سے جواب دیا: "کچھ پتہ نہیں کہ ہمارا کیا حشر ہوگا لیکن یہ بعید بھی نہیں کہ ہمارے لیے کوئی عبرت ناک سزا تجویز کی جائے۔"

میں نے کہا: "بادشاہ خواب گاہ میں آرام فرما رہے ہیں، کیا چوری سے ہمارا فرار ہو جانا مناسب نہیں ہے؟"

"بزدل کہیں کے۔" آقا مرزا نے غصے میں کہا۔ "ڈرتے کیوں ہو اگر ہمیں سزا ملی تو تم بھی سزا پاؤ گے۔"

میں نے دبے لفظوں میں پوچھا۔ "آقا مرزا! کیا بادشاہ سلامت روشن جبیں کو واقعی اپنے حرم میں ڈال لیں گے؟"

آقا مرزا نے جواب دیا: "کچھ بعید بھی نہیں۔"

میں نے معلوم نہیں کس طرح جوش میں عرض کیا: "آقا مرزا! اگر ایسا ہوا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ لوگوں سے دوری اختیار کر لوں گا۔"

آقا مرزا کے جی میں معلوم نہیں کیا آئی کہ انہوں نے نرمی سے کہا: "علی مرزا! ہم خود بھی تم پر ظلم نہیں ہونے دیں گے اگر اعلیٰ حضرت نے روشن جبیں کو قبول فرمانا چاہا تو ہم اس سے پہلے ہی اس لڑکی کو تمہارے حوالے کر دیں گے پھر تم اسے جہاں بھی چاہو لے جانا۔"

جب میں آقا مرزا سے جدا ہونے لگا تو انہوں نے مجھ سے کہا: "علی مرزا! ایک سخت معرکے کے لیے تیار رہو، بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں کو آگرے کے تاج و تخت کے لئے اپنی اپنی جان کی آخری بازی لگا دینی ہے، اس کا نتیجہ جو کچھ بھی نکلے ہمیں اس کی کوئی پرواہ نہ ہونی چاہیے۔ تخت یا تختہ دار، جو بھی مقدر میں ہوگا مل کر رہے گا، تقدیر سے ڈرنا کیسا؟"



آقا مرزا میرے اس تجربے سے بہت خوش ہوئے تھے جو میں آقا مرزا کے طمانچے کی پردہ پوشی کے سلسلے میں بول چکا تھا اور میرا پگھلتا ہوا اعتماد کسی حد تک پھر بحال ہو گیا تھا بادشاہ کی نرمی اور درگزری نے اسے ذرا بھی ممنونِ احسان نہ کیا تھا۔ وہ اب بھی ہمایوں کی جگہ اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہا تھا اور اس نے مجھے پھر بھی ہدایت کی کہ میں کسی بھی طرح ہمایوں کو راہ سے ہٹانے کی کوشش سے غافل نہ رہوں۔"

بادشاہ نے نظام سقہ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے کا اعلان کیا۔ تمام امرا و شہزادوں کو حکم دیا گیا کہ وہ نظام سقہ کے حضور پیش ہوں اور آدابِ بادشاہی بجا لائیں۔ نظام سقہ نے سر پر تاج رکھا اور تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو گیا۔ امرا اور شہزادے کورنش اور تسلیمات بجا لائے۔ خود بادشاہ بھی ایک امیر کی حیثیت سے نظام سقہ کے روبرو دست بستہ کھڑا رہا۔ بادشاہ کی نظریں آقا مرزا کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں بادشاہ کا مقصد بھانپ گیا اور ایک خدمت گار کے ذریعے بادشاہ کی قربت کا خواہاں ہوا۔ ہمایوں نے مجھے اپنے قریب بلایا اور پوچھا: "کیا تم ہم سے کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

میں نے آقا مرزا کا معذرت نامہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اس چند سطری عرض نامے میں تحریر تھا۔

"اعلیٰ حضرت! ناچیز طبیعت کی خرابی کی وجہ سے حاضری دینے سے قاصر ہے۔ اگر خاطرِ نازک پر گراں نہ گزرے اور اعلیٰ حضرت ناچیز کو اپنا ہمدرد اور بہی خواہ تصور فرماتے ہیں تو حقیر کی اس رائے سے ضرور اتفاق فرمائیں گے کہ نظام سقہ جیسے حقیر شخص کو دوسری بخششیں اور رعایتیں بھی دی جا سکتی تھیں اور یہ لازم نہ تھا کہ اسے تخت پر بٹھایا جاتا اور خاص کر اس نازک گھڑی میں کہ شیر خان ہمارے نزدیک آ چکا ہے، اعلیٰ حضرت کی یہ عنایت مضرت اور نقصان کا سبب بن سکتی ہے۔"

بادشاہ نے آقا مرزا کے اعتراض پر افسوس کیا، بولے: "آخر ہمارے بھائیوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اختلاف کی روش اختیار کرتے ہیں۔"

کئی دن تک آقا مرزا سے میری ملاقات نہ ہو سکی، میرا خیال تھا کہ وہ ضرور کسی سازش اور جوڑ توڑ میں مصروف ہوں گے لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ بیمار ہیں اور بیماری نے نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ میں نے آقا مرزا سے حاضری کی اجازت چاہی جو

باآسانی مل گئی۔ میں نے دیکھا منقش آبنوسی مسہری پر آکا مرزا داہنی کروٹ لیٹے ہوئے طبیب کو نبض دکھا رہے تھے۔ میں سامنے گیا اور نیازمندانہ آداب بجا لایا۔ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے عرض کیا۔ "آکا مرزا! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی علالت سے بتاخیر مطلع ہوا۔"

آکا مرزا نے افسوس سے کہا۔ "علی مرزا! ہم فوراً لاہور واپس جانا چاہتے ہیں۔ تم اعلاحضرت سے بصد ادب ہماری طرف سے عرض کرو کہ وہ ہمیں آگرے میں مزید نہ روکیں۔"

میں نے اپنی طرف سے بادشاہ کے خیال کی ترجمانی کی۔ میں نے کہا۔ "اعلاحضرت کا خیال ہے کہ اس نازک موقع پر ہم سب کو اتحاد اور یک جہتی کی ضرورت ہے۔"

آکا مرزا نے زہریلی نظروں سے مجھے گھورا اور اپنے طبیب کو حکم دیا۔ "ہالمرتبا بیان کیا جائے۔"

طبیب نے سر جھکا کر عرض کیا۔ "افسوس کہ حضور والا کو کھانے میں زہر دیا جا رہا ہے!"

آکا مرزا نے کرخت آواز میں کہا۔ "ہمیں یہ زہر کون دے رہا ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ اعلاحضرت کی ایما پر محل سرا کی بیگمات کھانے میں زہر دے کر ہمیں ہلاک کر دینا چاہتی ہیں!"

میرے جی میں آئی کہ میں بادشاہ کی تائید میں بولوں اور آکا مرزا کو بتاؤں کہ جو بادشاہ خطرناک باغیانہ اور سازشی خطوط کے پکڑے جانے پر عفو و درگزر سے کام لے رہا ہو اسے کھانے میں زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن میں خاموش رہا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ شکی اور سازشی آکا مرزا میرا کسی طرح بھی ہم خیال نہ بنے گا اور میں ایک بار پھر اپنا اعتماد کھو دوں گا۔

آکا مرزا نے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ "تم اعلاحضرت پر ہمارے خیالات کا اظہار کر دو اور ان سے کہو کہ ہم لاہور واپس جانا چاہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی جتا دو کہ ہمارا اتحاد اسی طرح قائم رہ سکتا ہے۔"

اس گفتگو کے دوران طبیب رخصت ہو گیا۔ میں بھی واپس آنا چاہتا تھا لیکن آکا مرزا نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے رکنے کا حکم دیا۔

ذرا دیر بعد آکا مرزا کی بیگمات آنے لگیں۔ چونکہ میں آکا مرزا سے ہمشیری رشتہ




رکھتا تھا اس لیے بیگمات مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھیں ان آنے والیوں میں وہ سرو قامت اور فتنہ ساماں روشن جبیں بھی شامل تھی جس کی تصویر میں اپنے دل سے لگائے پھرتا تھا اور جس کی وجہ سے میں تصویر پرستی کے الزام سے متہم ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میری عجیب حالت ہو گئی۔ میرا دل سینے میں یوں اچھلا جیسے وہ پسلیوں کا جنگلا توڑ کر باہر آ جائے گا۔

آکا مرزا میری حالت پر غور کر رہا تھا۔ شاید وہ مسکرایا بھی۔ روشن جبیں نے مجھ پر اچٹتی سی نظر ڈالی اور آکا مرزا کی پائنتی جا کھڑی ہوئی۔ میں نے زیر لب چند اشعار پڑھے جن کا مطلب تھا۔

"چند قدموں کا فاصلہ میرے حق میں ہزاروں میل کا فاصلہ بن گیا ہے۔ خدا جب دل میں عشق کی آگ روشن کرتا ہے تو اسی نسبت سے دیوانگی اور جنون میں بھی اضافہ ہونا چاہیے کیونکہ جو دل محبت کی تپش سے سرخ گلنار ہو رہا ہو وہ جنون اور دیوانگی کے بغیر ایسا ہے جیسے وہ گہرا سمندر جس کی موجوں میں اضطراب اور تڑپ نہ ہو۔"

آکا مرزا نے مجھے اپنے قریب بلا کر دوبارہ اشعار پڑھنے کی خواہش کی۔ میں نے سنا دیے۔ ان اشعار نے جادو کا کام کیا، اس نے روشن جبیں کو حکم دیا کہ وہ چند راتیں میرے ساتھ تخلیے میں گزار سکتی ہے۔ میں اسے اپنی قیام گاہ میں لے گیا۔ اس وقت میں جتنا خوش تھا زندگی میں وہ خوشی دوبارہ میسر نہیں آئی۔ روشن جبیں نے کرتے پر نیم تنا (واسکٹ) پہن رکھا تھا سرخ نیم تنے کے کنارے سنہری تاروں سے زردوزی تھے۔ اور سینے کے اوپر دونوں طرف روپہلے اور سنہری تاروں کی مدد سے گلاب کے پھول بنائے گئے تھے۔

وہ مجھ سے مل کر خوش نہیں ہوئی۔ بدستور اداس رہی میں نے افسردگی کا سبب پوچھا تو کہنے لگی۔ "علی مرزا! تم اس وقت تک میرے دکھوں کا اندازہ نہیں کر سکتے جب تک تم خود میری جگہ نہ لے لو۔"

میں نے کہا۔ "روشن جبیں! تم یقین کرو کہ میں تمہاری تصویر اپنے دل کے قریب رکھتا ہوں ایک دن تنہائی میں، میں تمہاری تصویر سے ہم کلام تھا اور وارفتگی میں بار بار اس کے بوسے لے رہا تھا کہ کسی چغل خور نے اعلاحضرت سے شکایت کر دی کہ میں

مسلمان ہو کر بت پرستی کر رہا ہوں، بادشاہ نے تمہاری تصویر مجھ سے چھین کر اس پیغلاتؔ کے حوالے کر دی اور اسے حکم دیا کہ یہ مقدمہ آگرے میں پیش کیا جائے یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ شاید اعلیٰ حضرت نے یہ حکم افیون کے نشے میں صادر فرمایا تھا کہ ہوش میں آتے ہی تمہاری تصویر مجھے واپس دلا دی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔"

روشن جبیں نے بالکل غیر متعلق سی بات کہنے لگی۔ "علی مرزا! میں کسی ایک کی ہو جانا چاہتی ہوں۔ مجھے اس بات سے بہت دکھ پہنچتا ہے کہ میں بظاہر تمہاری آغا قرار دی گئی ہوں لیکن تصرف میں تمہارے آکا مرزا کے رہتی ہوں اور اب یہ سننے میں آیا ہے کہ بادشاہ سلامت نے بھی مجھے یاد فرمایا ہے!"

روشن جبیں کی بات برمے کی طرح دل میں لہرا گئی اور میری آنکھوں تلے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔ "روشن جبیں! تم نے جو کچھ کہا کیا یہ سچ ہے؟"

روشن جبیں نے جواب دیا۔ "کلام اللہ اٹھا لاؤ میں یہی بات اسے ہاتھ میں لے کر پھر سے دہرا دوں گی۔"

میں ایک دم اجالے سے تاریکی میں چلا گیا اور میرا دماغ بالکل اس لائق نہ رہا کہ ان حالات اور اس انکشاف کے بعد کیا کہنا یا کیا کرنا چاہیے؟

مجھے گم سم دیکھ کر روشن جبیں نے پوچھا۔ "تم کیا سوچنے لگے؟"

میں نے بے اختیاری اور بدحواسی میں جواب دیا۔ "میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اب جبکہ تم میری نہیں رہیں، مجھے تمہارے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیے؟"

روشن جبیں نے چیں بہ چیں ہو کر کہا۔ "عجیب انسان ہو تم بھی، کہاں تو عشق کا یہ دعویٰ کرتے رہے کہ تمہیں عورت سے خدا نے ملا دیا تھا اور کہاں یہ عالم ہے کہ محبت سے کنارہ کشی کی سوچ رہے ہو!"

میں نے پوچھا۔ "روشن جبیں! تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم سب سے زیادہ کسے پسند کرتی ہو؟"

اس نے کہا۔ "جو مجھے سب سے زیادہ چاہے گا اور عیش و آرام پہنچائے گا میں اسی کو سب سے زیادہ چاہوں گی۔"

"تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ تم ابھی تک کورے کاغذ کی طرح ہو جس پر کسی کی تحریر کا نشان تک نہیں پایا جاتا۔"



روشن جبیں نے جواب دیا۔ "ایسا ہی سمجھ لو۔"

میرا دل اچاٹ ہو گیا، میں نے اسے چلے جانے کا حکم دیا جس کی اس نے تعمیل نہیں کی اور مجھ سے اختلاط اور لگاوٹ کی باتیں کرنے لگی۔ مجھے اس کی صحیح الدماغی پر شبہ ہونے لگا لیکن بعد میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ محل سرا کے ماحول اور آکا مرزا کے طریقوں نے اسے بگاڑ دیا ہے اور اب وہ اس لائق نہیں رہی کہ میں اس کی مالا جپتا رہوں۔ اعتماد اور گمان کی شکست نے مجھے کہیں کا بھی نہ رکھا اور جی میں آیا کہ میں سب کچھ چھوڑ کر کہیں بہت دور چلا جاؤں۔ مایوس انسان کی طرح یہ سوچ کر کہ اب کیسے روشن جبیں سے مستقل تعلق رکھنا ہے جو بہتر ہے اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ میں دیر تک اپنا غم غلط کرتا رہا۔ روشن جبیں نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ لیکن بالکل آخر میں جبکہ وہ واپس جانے والی تھی کھلکھلا کر ہنس دی اور کہنے لگی۔ "علی مرزا! میں تمہیں عقلمند انسان سمجھتی تھی لیکن تم اس کے برعکس نکلے، اب تک میں نے جو کچھ کہا تھا۔ جھوٹ کہا تھا۔ میں تمہیں آزما رہی تھی، یہ دیکھنے کے لئے کہ تم مجھے واقعی چاہتے ہو یا گپ مار رہے ہو۔ پتہ چلا تمہارے سارے دعوے بس یوں ہی تھے۔"

میں پھر چکرا گیا اور افسردہ آواز میں کہا۔ "پتہ نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ ہے ہو سکتا ہے یہ بھی جھوٹ ہی ہو جسے تم سچ کی طرح باور کرا رہی ہو۔"

روشن جبیں ایک دم سنجیدہ ہو گئی، بولی۔ "تمہاری مرضی جو چاہو سمجھو۔ لیکن مجھے تم بہت پسند ہو، اگر مجھے یہ اختیار دیا جائے کہ میں کسی ایک سے محبت کر کے اسے اپنا سکتی ہوں تو وہ شخص بے شک و شبہ تم ہو گے۔"

میں نے اسے فرطِ محبت سے آغوش میں لے لیا۔ وہ بے زاری سے مجھ سے پیچھا چھڑانے لگی اور کہا۔ "تم نے مجھے مایوس کیا ہے علی مرزا! مجھے تمہارے یہ چونچلے اب اچھے نہیں لگتے۔"

اسی طرح ہم دونوں کتنے گھنٹے تک یک جا رہے۔ کبھی وہ روٹھتی میں مناتا، کبھی میں منہ پھلا لیتا اور وہ منانے لگتی اور اس میں ہم دونوں نے اتنا مزہ اور لطف حاصل کیا کہ وہ شاید پیار و محبت کی سیدھی سادی گفتگو میں نہ میسر آتا۔

بادشاہ کو آکا مرزا کے شبہات اور شاہی طبیب کی تشخیص کا جیسے ہی علم ہوا میرے ساتھ آکا مرزا کے پاس پہنچے اور قرآن پاک ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "مرزا کامران! تم ان اندیشوں کو دل سے نکال دو، ہم تو اس کا اپنے دل میں خیال تک نہیں لا سکتے۔"

آکا مرزا خاموش رہے اور اعلیٰحضرت کی شکل دیکھتے رہے۔

اس دوران میں یہ خبر ملی کہ شیر خان قنوج تک آچکا ہے۔ بادشاہ نے آگرے کی حکومت آکا مرزا کے حوالے کی اور خود افواج لے کر شیر خان کے مقابلے پر پہنچ گئے۔ آکا مرزا کو جیسے ہی یہ خبر ملی کہ بادشاہ نے کشتیوں کے پل کے ذریعے گنگا کو عبور کر لیا ہے، فوراً آگرہ چھوڑ دیا اور اپنی سپاہ کے ساتھ لاہور چلے گئے۔ عین میدانِ جنگ میں مجھے آکا مرزا کا یہ خفیہ پیغام ملا کہ

"گزشتہ کوتاہیوں کو مت دہرانا۔ لاہور یا کابل میں روشن جبیں تمہارا انتظار کرے گی!"

میں سمجھ گیا کہ اس طرح آکا مرزا بادشاہ کو راستے سے ہٹانے اور اس کے صلے میں روشن جبیں کے حاصل کرنے کا پیغام دے رہے تھے۔ دریائے گنگا کے کنارے بڑے زور کا رَن پڑا جس میں بادشاہ کو شکست ہو گئی اور وہ بدقت تمام آگرے واپس پہنچے وہاں کے امرا نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ وہ لاہور کا رُخ کریں کیونکہ قنوج کے بعد شیر خان کا دوسرا قدم آگرے ہی میں ہو گا۔

بادشاہ فوراً لاہور روانہ ہو گئے اور شیر خان بھی موت کے سائے کی طرح ان کے تعاقب میں لگا رہا۔ آکا مرزا بادشاہ کی آمد سے پریشان ہو گیا اور اس کوشش میں لگ گئے کہ کسی طرح بادشاہ کو لاہور سے نکال باہر کریں۔ بادشاہ کامران مرزا کے باغِ دل آمیز میں ٹھہر گئے تھے۔ یہ باغ کامران مرزا نے دریائے راوی کے کنارے لگایا تھا۔ بادشاہ ابھی یہاں چین سے بیٹھے بھی نہ تھے کہ پتہ چلا شیر خان سرہند تک پہنچ چکا ہے۔

بادشاہ نے تشویش کے عالم میں مجھے طلب کیا اور کہا۔ "علی مرزا! تم ایک بار پہلے بھی شیر خان کے پاس جا چکے ہو؟"

میں نے عرض کیا۔ "بے شک۔ کوئی نیا حکم؟"

بادشاہ نے کہا۔ "نیا حکم کوئی نہیں ہے بے سروسامانی کے عالم میں حکم دینے کا کسے ہوش ہے!"

میں نے عرض کیا "یہ ناچیز اعلیٰحضرت کا تابعدار ہے حکم فرمائیں یہ سر دے کر اس کی تعمیل بجا لائے گا۔"

بادشاہ نے اسی وقت مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ کو طلب کیا۔ یہ دونوں دربار کے معزز امرا میں گنے جاتے تھے۔ بادشاہ نے شیر خان کو ایک خط لکھا۔



"شیر خان! تم کبھی دربارِ مغلیہ کے نمک خوار تھے اور اب ہمیں اپنا نمک خوار بنانے کی فکر میں ہو، شیر خان! خدا سے ڈرو، آخر تم اتنا ظلم کیوں کر رہے ہو؟ ہم نے تمہارے لئے پورا ہندوستان چھوڑ دیا ہے تم لاہور ہمارے لئے چھوڑ دو اور اس وقت سرہند میں جہاں تم ٹھہرے ہوئے ہو اسے ہمارے اور اپنے درمیان حد قرار دے لو!"

یہ خط بادشاہ نے ہمارے حوالے کیا اور حکم دیا کہ اسی وقت شیر خان سے مل کر اس کا جواب لاؤ۔

میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ آکا مرزا نے خفیہ طور پر مجھے ایک خط شیر خان کے نام دیا۔ اس میں آکا مرزا نے لکھا تھا کہ "شیر خان! تم نے ہم سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ صلح کر لو گے، بھائی ہمایوں ہندوستان سے رخصت ہونے والے ہیں کیا تم اپنا وعدہ پورا کرنے میں تجاہل سے کام لے رہے ہو، یا کوئی اور مصلحت ہے؟"

میں نے آکا مرزا سے پوچھا۔ "آپ کی شیر خان سے بات چیت کب سے چل رہی ہے؟"

آکا مرزا نے سنسنی خیز انکشاف کیا۔ "جب ہم آگرے میں تھے، شیر خان نے ہمیں یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہم اعلیٰحضرت کا ساتھ نہ دیں اور اپنی فوج لے کر لاہور چلے جائیں تو شیر خان اس نرم رویئے کے صلے میں ہمیں لاہور میں حکومت کرنے دے گا اور ہم سے مقابلہ نہیں کرے گا!"

میں آکا مرزا اور بادشاہ کا پیغام لے کر سرہند پہنچ گیا۔ مظفر بیگ اور قاضی عبداللہ شیر خان کے روبرو پہنچ کر بہت زیادہ مرعوب ہو گئے۔ میں نے بدقت تمام اپنے بادشاہ کا پیغام شیر خان کو پہنچایا اور چپکے سے آکا مرزا کا پیغام بھی دے دیا۔ شیر خان نے اس کا فوراً جواب نہیں دیا، بلکہ یہ کہا کہ تم لوگ لاہور واپس جاؤ ہمارا آدمی جوابات لے کر خود ہی حاضر ہو جائے گا۔"

ہم لوگ واپس چلے آئے اور آکا مرزا اور بادشاہ بے چینی سے شیر خان کے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور بادلوں کے متوالے ٹکڑے اپنے پیٹ پھلاتے اُڑتے پھر رہے تھے۔ بادشاہ باغِ دل آمیز کی بارہ دری میں موسم کا مزہ لے رہے تھے کہ خدامِ شاہی نے مطلع کیا۔ "شیر خانی قاصد جوابات لے کر حاضر ہو گیا ہے!"

بادشاہ لفظ "جوابات" پر چونک پڑے انہوں نے اسی وقت یہ فرمان جاری کیا کہ شیر خانی جوابات کو سننے اور اس پر غور و خوض کرنے کے لئے فوراً ایک مجلس منعقد کی جائے جس میں سات سال سے لے کر ستر سال تک کے مرد شرکت کریں۔"

وہیں بارہ دری میں ہم سب جمع ہو گئے، شیر خانی قاصد ہمارے سامنے بُلایا گیا اور اس نے دو خط بادشاہ کے حوالے کر دیئے۔ آکا مرزا نہایت ہوشیاری سے فرار ہو کر اپنے اُنو لکھا باغ' میں روپوش ہو گیا۔

بادشاہ کے خط کا جواب شیر خان نے دیا تھا۔ "تم سرہند کو حدِ فاصل بنانا چاہتے ہو ہم تمہاری درخواست مسترد تو نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم نے تمہارے لیئے کابل چھوڑ دیا ہے تم لاہور سے کابل چلے جاؤ!"

بادشاہ کو اس مختصر اور پُر رعونت جواب پر غصّہ تو بہت آیا لیکن آپ درویش بر جان درویش، کر بھی کیا سکتے تھے۔ خون کے گھونٹ اور صبر کا تلخ پھل حلق کے نیچے اُتار لیا۔
اس کے بعد آکا مرزا کے خط کا جواب پڑھا گیا۔ شیر خان نے آکا مرزا کو لکھا تھا:

"کامران مرزا! جب تک ہم نے آگرہ فتح نہیں کیا تھا، حالات کچھ اور تھے، اب حالات کچھ اور ہیں، چند دنوں کی بات ہے کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں تلے ہو گا ہمارا یہ مشورہ ہے کہ تم ہم سے جنگ آزما ہو کر بلا وجہ اپنی فوجی قوت کو نقصان نہ پہنچاؤ تم کابل چلے جاؤ، ہم وہاں نہیں آئیں گے!"

آکا مرزا کی سازش کا بھانڈا پھوٹنا تھا کہ مجلس کے جملہ ارکان "شرم شرم" کی آوازیں بلند کرنے لگے اور کسی قطعی فیصلے تک پہنچنے سے پہلے ہی مجلس برخاست ہو گئی۔ بادشاہ نے شیر خانی قاصد کو یہ کہہ کر روانہ کر دیا کہ اپنے بادشاہ سے کہہ دو کہ ہم سب خدائی احکام کے پابند ہیں، اگر وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم کابل چلے جائیں تو ضرور چلے جائیں گے لیکن چونکہ ہمیں ابھی خدا کے آخری فیصلے کا کوئی علم نہیں ہے اس لیئے پوری قوت سے ہم برابر یہاں رکنے کی کوشش کریں گے۔

بادشاہ دل برداشتہ ہو کر حرم میں چلے گئے۔ ایک دن اچانک بادشاہ نے مجھے یاد فرمایا جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں مجلس مشاورت جمی ہوئی ہے۔ بادشاہ کے بھائی مرزا ہندال بھی وہیں موجود تھے اور ان کے چہرے کا کھنچاؤ یہ بتاتا تھا کہ وہ کسی بات پر سخت برہم ہیں بادشاہ کے چہرے پر ملال کے اثرات تو ضرور تھے لیکن غصّہ نہیں پایا جاتا





تھا۔

بادشاہ نے مجھے دیکھتے ہی اپنے قریب بُلایا اور نہایت ملامت سے سوال کیا "علی مرزا! دیکھو، مرزا کامران کے مقابلے میں ہم تم سے کہیں زیادہ وفاداری کا حق رکھتے ہیں، سچ سچ بتاؤ یہ مرزا کامران آخر چاہتا کیا ہے؟"

میں نے عرض کیا۔ "اعلیٰ حضرت! یہ ناچیز بس اتنا ہی عرض کر سکتا ہے کہ جو سودا شیر خان کے دماغ میں سمایا ہوا ہے وہی آکا مرزا بھی چاہتے ہیں اور جو جسے حاصل ہے اس سے زیادہ کی ہوس انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے!"

مرزا ہندال نے طیش میں کہا۔ "اعلیٰ حضرت! جب تک مرزا کامران کو عبرت ناک سزا نہیں دی جائے گی، شاہی افواج میں اتحاد اور یک جہتی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور انہیں ہر محاذ پر شکست کا سامنا ہو گا!"

چند دوسرے شہزادوں نے بھی مرزا ہندال کے خیال کی تائید کی اور سر جھکا لیے، لگر مجھ کو بادشاہ کے انداز سے یہ شبہ گزرنے لگا کہ شاید آج مرزا کامران کے خلاف کوئی خطرناک فرمان صادر ہو کر رہے گا۔

مرزا ہندال نے مزید کہا۔ "شاید حضور والا کو اس بات کا علم نہیں کہ ہم سے جو لغزشیں یا گستاخیاں سرزد ہو چکی ہیں ان میں مرزا کامران کا ہاتھ ضرور موجود تھا، وہ نہیں چاہتا کہ اعلیٰ حضرت بادشاہ کہلائیں، وہ اپنی بادشاہت کے خواب دیکھ رہا ہے!" اور وزرا دھیمے لہجے میں کہا۔ "اور خدا نے ہمیں یہ صریح حکم دے رکھا ہے کہ موذی کو ایذا پہنچانے سے پہلے قتل کر دو۔"

ہمایوں نے بے چین ہو کر سر اٹھایا اور صاف اور صریح لہجے میں جواب دیا۔ "مرزا ہندال! بابا جان نے ہمیں یہ نصیحت کی تھی کہ بھائیوں کا خیال رکھنا اور ان کی بڑی سے بڑی غلطی سے درگزر کرنا۔ پھر ہم دو دن کی زندگی کو مرزا کامران کے خون سے داغ دار کیوں کر لیں۔ ہم مرزا کامران کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔"

بادشاہ کے اس دو ٹوک فیصلے نے ہم سب کو بہت متاثر کیا اور اس کی عظمت کا ہمیں دل و جان سے قائل ہونا پڑا۔



مرزا کامران کو خطرہ ہوا کہ بادشاہ سلامت کہیں کابل کا رُخ نہ کریں اس لئے بادشاہ کو اس خیال سے باز رکھنے کی کوشش کی اور بالآخر بادشاہ کو بتائے بغیر اپنی فوج کے ساتھ کابل

روانہ ہو گیا اور دل میں یہ ارادہ کر کے گیا کہ اگر ہمایوں نے کابل کا رخ کیا تو انہیں بزورِ قوت روک دیا جائے گا۔

بادشاہ نے مایوس ہو کر واقعی کابل کا رخ کیا، ابھی دہ ہزارہ تک پہنچے تھے کہ مخبروں نے خبر دی، مرزا کامران مزاحمت اور مقابلے کی نیت سے واپس آ رہا ہے۔ بادشاہ کے ہمراہی پریشان ہو گئے اور انہوں نے دریافت کیا۔ "کیا ہم سب بھی ہتھیاروں سے لیس ہو کر مرزا کامران کا انتظار کریں؟"

ہمایوں نے جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں، جب ہتھیاروں کی ضرورت ہو گی تو ہم خود ہی اس کے احکام صادر فرما دیں گے!"

بادشاہ کی نرمی سے لوگ دل برداشتہ اور مایوس ہونے لگے۔ بادشاہ زرہ بکتر پہنے ہوئے ہم سب کے سامنے نمودار ہوتے اور یہ سنسنی خیز خبر سنائی کہ "مرزا کامران آ چکا ہے اور اس نے بادشاہ سے قدم بوسی کی اجازت چاہی ہے!"

لوگ کچھ ہونے کے دھڑکے میں کسی اہم اعلان کی امید کرنے لگے۔

اس وقت میں بادشاہ کے قریب ہی تھا۔ آکا مرزا ایک طرف سے اچانک نمودار ہوئے اور بڑھ کر بادشاہ کے قدموں میں جھک گئے اور پنڈلیاں پکڑ کر آنسو بہانے لگے۔ بادشاہ نے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا۔ "کامران مرزا! میرے بازو میری قوت، روتے کیوں ہو، آؤ اور مردوں کی طرح آنسو پونچھ کر ہمارے روبرو کھڑے ہو جاؤ!"

جب ہاتھ پکڑ کر آکا مرزا کو اٹھایا گیا تو وہ ہچکیاں لے رہے تھے۔

بادشاہ نے ان کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور پوچھا۔ "کامران مرزا! تم کیوں رو رہے ہو؟"

آکا مرزا نے تقریباً ہچکیوں میں جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! ہندوستان کی آب و ہوا نے ہماری صحت بگاڑ دی ہے ایک تو صحت خراب ہے اس پر مسلسل جنگیں، ان پریشانیوں نے ہمیں عاجز کر رکھا ہے!"

بادشاہ نے پوچھا۔ "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

آکا مرزا نے کہا۔ "اعلیٰ حضرت ہمیں کابل چلے جانے کی اجازت مرحمت فرما دیں!"

بادشاہ نے جواب دیا۔ "تم کابل جا سکتے ہو، اور کچھ؟"

آکا مرزا نے عرض کیا۔ "حضرت فردوس مکانی (بابر) نے اپنی زندگی ہی میں کابل ہماری والدہ کو دے دیا تھا، اگر اسے جنگ و جدال سے محفوظ رکھا جاتے تو بڑا کرم ہو گا!"





بادشاہ کو آکا مرزا کی اس درخواست نے پریشان کر دیا۔ کہا: "کامران مرزا! یہ بھی تو سوچو کہ ہندوستان چھوڑنے کے بعد ہم سر کہاں چھپائیں گے؟"

"بے حس اور خود غرض" آکا مرزا نے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت کی فکر فلک گیر ہیں پناہ گاہیں تلاش کر سکتی ہے، ایک کابل ہی پر کیا موقوف ہے!"

ہمایوں نے کہا۔ "کامران مرزا! کابل تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا، ہم تو دم لینے آئیں گے اور بس!"

لیکن آکا مرزا کسی طرح بھی اس پر تیار نہ ہوتے کہ بادشاہ کابل جائیں۔ آخر کار بادشاہ نے کامران مرزا سے وعدہ کیا کہ وہ کابل نہیں جائیں گے اور دہ ہزارہ سے واپس ہو کر سندھ کی طرف چل پڑے۔ آکا مرزا کابل چلے گئے۔ اور یہیں سے شاہی خاندان کے بعض دوسرے افراد کے ساتھ مرزا ہندال نے بھی بادشاہ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ مرزا ہندال گجرات چلے گئے۔ آکا مرزا نے کابل کی راہ لی، ظاہر ہے روشن جبیں بھی ان کے ساتھ ہی ہو گی، میں بادشاہ کے ساتھ سندھ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اب میں حالات کے ایک ایسے موڑ پر آ چکا تھا جہاں مستقبل کا تعین کرنا بہت دشوار تھا، میرے سامنے یا تو اتھاہ تاریکیاں تھیں یا سنگلاخ، ویران میدان، بے برگ و گیاہ صحرا۔ بادشاہ نے مجھ سے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو کامران مرزا کے پاس چلے جاؤ!"

میں نے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! کابل کا گوشۂ سکون و انبساط اپنے دامن میں ویسی عظمت نہیں رکھتا، جیسی مجھے آپ کی بے سر و سامان ہم رکابی میں حاصل رہے گی۔"

بادشاہ نے جیسی نظروں سے مجھے دیکھا، میں یقین اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ان میں میرے لیے شکر اور امتنان، احسان و اطمینان کا بے پایاں جذبہ موجود تھا۔

ہمایوں کی یہ داستان جو آپ پڑھ رہے ہیں، اس میں بڑی عبرتیں ہیں، اس میں انسان کی عظمت و ذلالت پہلو بہ پہلو موجود ہے۔ میں علی مرزا، جو اس داستان کا راوی ہوں، بے جان چوب کا پتلا ہوں، شروع سے آخر تک میں یہی چاہوں گا کہ دیانت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور مجھے جو جیسا نظر آیا، اس کو اسی طرح پیش کر دیا جائے۔

جب بادشاہ بھکر میں داخل ہوا تو پتہ چلا، ہندال مرزا واپس آ گیا ہے۔ شاہی خاندان نے شہزادے کی واپسی کی خوشی میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضری دی۔ عورتوں

میں حمیدہ بانو بیگم بھی تھیں۔ یہ مرزا ہندال کی سسرالی عزیز تھیں۔ بادشاہ کو حمیدہ بانو بیگم بہت پسند آئیں، تادیر انہیں دیکھتے رہے پھر پوچھا۔ "ان کی تعریف؟"

کسی نے عرض کیا۔ "یہ میر بابا دوست کی صاحبزادی حمیدہ بانو بیگم ہیں!"

بادشاہ نے کہا۔ "میر بابا دوست ہمارے رشتہ دار ہوتے ہیں!" پھر بیگمات سے فرمایا۔ "ہمیں حمیدہ بانو بیگم پسند آگئی ہیں۔ ان کے بزرگوں سے کہو، انہیں ہمارے نکاح میں دے دیں!"

مرزا ہندال بگڑ گئے۔ تیوریوں پر بل ڈال کر بولے۔ "اعلیٰحضرت! اس لڑکی کو ہم اپنی بہن یا بچی تصور کرتے ہیں، آپ غریب الوطن بادشاہ ہیں ان حالات میں اگر لڑکی کو اچھی طرح نہ رکھ سکے تو کیا ہوگا؟"

بادشاہ کو میں نے پہلی بار ناراض اور خفا ہوتے دیکھا، وہ غصے میں اٹھے اور ایک طرف چلے گئے۔

مرزا ہندال کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی، بادشاہ کو جاتے ہوئے اطمینان سے دیکھتے رہے۔

مرزا ہندال کی ماں نے بیٹے کو ڈانٹا کہ بادشاہ کو ناراض نہیں کرنا چاہیے۔ انہوں نے بادشاہ کو نہایت تسلی آمیز خط لکھا اور اعلیٰحضرت کو یقین دلایا کہ وہ حمیدہ بانو بیگم کو بادشاہ سے شادی کر لینے پر آمادہ کر رہی ہیں لیکن حمیدہ بانو تیار نہیں ہو رہی ہیں۔ ایک دن بادشاہ سلامت نے تمام بیگمات کو اپنے گرد جمع کیا، شاندار محفل جمی لیکن اس محفل میں حمیدہ بانو نہیں پہنچیں، بادشاہ نے کسی بیگم کو حکم دیا کہ وہ حمیدہ بانو کو بھی بلا لائیں۔ جب انہیں بتایا گیا تو انہوں نے کہلوا بھیجا۔

"اعلیٰحضرت سے کہو کہ اگر اس ناچیز کی طلبی کورنش و تسلیمات بجا لانے کی غرض سے ہو رہی ہے تو گذشتہ روز میں یہ عزت حاصل کر چکی ہوں!"

اس بار بادشاہ نے مرزا ہندال کو حکم دیا۔ "مرزا ہندال! حمیدہ بانو تمہاری عزیزہ ہیں تم انہیں ہمارے روبرو لاؤ۔"

مرزا ہندال تھوڑی دیر بعد واپس آئے اور عرض کیا۔ "اعلیٰحضرت! حمیدہ بانو کہتی ہیں کہ بادشاہوں کو ایک بار دیکھ لینا تو جائز ہے لیکن بار بار دیکھنا جائز نہیں کیونکہ بادشاہ بھی نامحرموں میں آتے ہیں!"

بادشاہ نے ہنس کر جواب دیا۔ "اس شریف لڑکی سے کہو کہ اگر ہم نامحرم ہیں تو





عنقریب محرم بھی بن جائیں گے وہ سامنے تو آئے!"

یہ بالکل فطری بات ہے کہ بادشاہ کی طرف سے حمیدہ بانو کے لئے جتنا اشتیاق بڑھ رہا تھا مجھے اپنی روشن جبیں شدت سے یاد آرہی تھی۔ اپنی ناکامی اور مجبوری نے چولا بدلا اور حاسدانہ روش اختیار کی۔ اس وقت میری سب سے بڑی یہ خواہش تھی کہ اے کاش بادشاہ حمیدہ بانو کو حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

میں نے سنا، ہندال مرزا کی ماں چالیس دن تک حمیدہ بانو کے پیچھے پڑی رہیں اور انہوں نے حمیدہ بانو سے کہا۔ "بچی! یہ بات تو نہیں ہے کہ تم شادی ہی نہ کرو، آخر کار کسی نہ کسی سے تو شادی کرو گی ہی، پھر بادشاہ سے بہتر کون آدمی ہوگا؟"

حمیدہ بانو بدستور انکار کر رہی تھیں، بولیں۔ "یقیناً میں کسی نہ کسی سے شادی ضرور کروں گی لیکن وہ ایک ایسا شخص ہوگا جس کا گریبان میرے ہاتھوں کی دسترس میں ہوگا اور یہ بادشاہ سلامت تو ان کا گریبان تو گریبان، دامن تک ہاتھ نہ پہنچیں گے!"

پھر معلوم نہیں کس طرح حمیدہ بانو شادی پر آمادہ ہو گئیں۔ بادشاہ نے اسطرلاب ہاتھ میں لے کر مبارک گھڑی کا انتخاب فرمایا اور میر ابوالبقا نامی ایک بزرگ کے ذریعے نکاح پڑھوایا اور میر ابوالبقا کو دو لاکھ روپے بطور حق نکاحانہ عطا فرمائے۔ نکاح کے تین دن بعد بھکر روانہ ہو گئے۔

بادشاہ اور حمیدہ بانو کا ملاپ میرے دل پر کوہ گراں بن کر گرا اور میری طبیعت بادشاہ کی طرف سے اچاٹ ہو گئی۔ میں جلد از جلد آکا مرزا کے پاس چلا جانا چاہتا تھا لیکن ابھی بادشاہ کی قسمت کا ستارہ گردش میں تھا اور وہ سندھ کے ریگستان میں بھٹکتے پھر رہے تھے۔ جیسلمیر کے ہندو راجہ نے تو یہاں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو اپنی اطاعت و احترام کا یقین دلا کر بلانا چاہا، اس کا ارادہ یہ تھا کہ جب بادشاہ اس کے قلعہ میں چلے جائیں گے تو وہ انہیں گرفتار کر کے شیر شاہ کی خدمت میں روانہ کر دے گا اور اس طرح شیر شاہ کا اعتماد حاصل کر لے گا لیکن کسی طرح بادشاہ کو اس کے ارادوں کا علم ہو گیا اور وہ جیسلمیر جانے کے بجائے عمرکوٹ روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ راستے ہی میں تھے کہ بادشاہ کے آدمی دو آدمیوں کو پکڑ لائے اور کہا۔ "یہ دونوں جیسلمیر کے راجہ کے جاسوس ہیں!"

ان دونوں کے ہاتھ رسیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ بادشاہ سلامت نے ان سے بازپرس شروع کی، ابھی سوال و جواب کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ دونوں قیدیوں نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر خود کو رسیوں سے آزاد کر لیا اور بادشاہ کے آدمیوں کی کمروں سے تلواریں

پہنچ کر مارکاٹ شروع کر دی، بادشاہ گھبرا کر پیچھے ہٹے لیکن اس کوشش میں ان کا گھوڑا مارا گیا۔ بادشاہ کے آدمیوں نے ان پر بڑی مشکل سے قابو پایا اور ان دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ ابھی اس ناگہانی افتاد کا اثر کم بھی نہ ہوا تھا کہ شور اٹھا جیسلمیر کا راجا مالدیو بادشاہ کو گرفتار کرنے آن پہنچا ہے۔ بادشاہ کا گھوڑا کام آچکا تھا۔ ایک گھوڑا حمیدہ بانو کی سواری میں تھا، بادشاہ کے آدمیوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بادشاہ نے تردی بیگ نامی ایک امیر سے درخواست کی کہ "ہمیں سواری کے لیے ایک گھوڑا دے دو؟"

لیکن تردی بیگ نے انکار کر دیا۔ بادشاہ پیشانی پر ناگواری کی شکن لاتے بغیر ایک اونٹ کی طرف بڑھے اور حمیدہ بانو کو گھوڑے پر آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ ندیم بیگ نامی ایک دوسرا امیر آگے بڑھا اور اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیا اور پھر یہ آوارہ گردوں اور بدنصیبوں کا قافلہ عمرکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں مالدیو کے آدمیوں نے روکنے کی کوشش کی لیکن بادشاہ کے کسی تیرانداز کے تیر نے اتفاقیہ طور پر مالدیو کی سپاہ کے سردار کو زخمی کر کے گھوڑے سے گرا دیا جس سے اس کی سپاہ ڈر کر بھاگ گئی اور بادشاہ کا قافلہ عمرکوٹ پہنچ گیا۔

عمرکوٹ کا رانا بادشاہ کے استقبال کے لیے خود آیا اور نہایت عزت و احترام سے اپنے قلعے میں لے گیا اور بادشاہ کے آدمیوں کو قلعے کے باہر ہی رکھا۔

جیسا کہ میں پیچھے لکھ آیا ہوں کہ اب میں بادشاہ سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا مجھے بادشاہ کے روشن مستقبل پر ذرا بھی یقین نہ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اس دورِ غربت و مسافرت میں کسی جگہ بھی بادشاہ مارا جا سکتا تھا۔ جب میں نے بادشاہ سے رخصت کی اجازت چاہی تو انہوں نے دریافت کیا۔ "اب کہاں جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں کابل جانا چاہتا ہوں؟"

بادشاہ کچھ دیر متفکر رہے، پھر فرمایا۔ "اچھا، اگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو ضرور جاؤ، ہمارے حالات ابھی بڑے غیر یقینی ہیں اور پتہ نہیں کس وقت کیا ہو جائے؟" پھر پوچھا "ہم تم سے چند سوال کرنا چاہتے ہیں کیا تم ان کے جوابات خدا کو حاضر و ناظر جان کر سچ سچ دو گے؟"

میں نے فدویانہ عرض کیا۔ "حضرت سلامت نے اب تک اس ناچیز پر جو کرم گستری فرمائی ہے وہ مجھے اگر چاہوں بھی تو جھوٹ نہ بولنے دے گی۔"



بادشاہ خوش ہو گیا اور کہا۔ "کامران ہمارا بھائی ہے اور ہم تمہارے بادشاہ ہیں تم کامران کے نوکر (دردہ شریک) ہو۔ اب ہمیں یہ بتاؤ کہ اگر کوئی وقت پڑے تو تم کس کا ساتھ دو گے، کامران کا یا ہمارا؟"

میں پریشان ہو گیا، جواب کے ایک طرف کنواں تھا تو دوسری طرف کھائی۔ اگر میں آکامرزا کے حق میں جواب دیتا جو میرا آقا تھا تو بادشاہ کی ناراضی کا خطرہ تھا اور اگر جھوٹ بول کر بادشاہ کی حمایت میں جواب دیتا تو شریف النفس بادشاہ شاید یہ سوچنے لگتا کہ جو اپنے نوکر کا نہ ہوا وہ کسی اور کا کس طرح ہو گا۔ اچانک ایمان کی روشنی عقل کی گمراہی پر غالب آئی اور میں نے جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! رسول اللہؐ کی حدیث ہے کہ مسلمانو! تم اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم اور جب کسی نے یہ پوچھا تھا کہ ظالم کی مدد کس طرح کی جائے؟ تو آپ نے جواب دیا تھا کہ ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے روک دیا جائے۔"

بادشاہ میرے جواب سے بہت خوش ہوئے اور مجھے واپسی کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا۔ "ہماری پھوپھی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، وہ کامران کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں گی۔"

میں بادشاہ کی پھوپھی خانزادہ بیگم کو لے کر کابل روانہ ہو گیا۔ اس وقت جہاں مجھے بادشاہ کی ہم نشینی چھوڑنے کا غم تھا وہیں یہ خوشی بھی تھی کہ میں حمیدہ بانو اور بادشاہ کے پرمسرت ملاپ کی تلخی سے محفوظ ہو گیا تھا۔

مجھے ملتے ہی میں اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ آکامرزا میرزا ہندال کے علاقے قندھار پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں۔ قندھار کے حکمران قراچہ خاں نے ازراہ نوازش اور بادشاہ نوازی اپنے ایک مکتوب کے ذریعے قندھار کی حکومت مرزا ہندال کو بخش دی تھی لیکن آکامرزا اس فکر میں تھے کہ قندھار بھی اپنے قبضے میں کر لیا جائے۔

حضرت بادشاہ کی پھوپھی خانزادہ بیگم نے مجھے حکم دیا کہ "کابل کے بجائے قندھار چلو، میں وہیں کامران مرزا کو بلا کر دونوں بھائیوں (آکامرزا اور مرزا ہندال) میں اتحاد کرا دوں گی۔"

ہم بدقت تمام قندھار پہنچ گئے۔ عسکری مرزا، آکامرزا کے حکم پر اس کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ ہمیں قندھار میں داخلے کی اجازت نہیں ملی، باہر ہی روک لیا گیا۔ عسکری مرزا اپنی پھوپھی کی خدمت میں آیا۔ سمجھالا ہا، خانزادہ بیگم (پھوپھی) نے عسکری مرزا کو حکم دیا کہ

"کامران مرزا کو فوراً بلاؤ، میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"
چوتھے دن آ کا مرزا بھی حاضر ہو گئے۔ وہ خانزادہ بیگم سے ادب و احترام سے پیش آتے لیکن مجھے خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ خانزادہ بیگم انہیں خلوت میں لے گئیں اور کچھ دیر تک سمجھاتی رہیں جس کا تفصیلی علم نہ ہو سکا بعد میں اتنا ضرور معلوم ہوا کہ وہ آ کا مرزا کو اتحاد اور اخلاص کی تلقین کرتی رہیں اور آ کا مرزا اس پر مصر رہے کہ کابل کی طرح قندھار میں بھی ان کے نام کا خطبہ پڑھا جائے۔

پھر آ کا مرزا اور خانزادہ بیگم میں زور زور سے باتیں ہونے لگیں۔ خانزادہ بیگم کہہ رہی تھیں۔ "کامران! اگر تم مجھ سے پوچھتے ہو تو میں یہی کہوں گی کہ ہمایوں کی بادشاہت کا فیصلہ خود فردوس مکانی (بابر) فرما گئے ہیں اور ایک عرصے تک تم خود بھی اسی کے نام کا خطبہ پڑھتے رہے ہو، تمہیں اب بھی ہمایوں کو اپنا بڑا سمجھنا چاہیئے۔ اس کی فرماں برداری کرو کیونکہ اسی میں ہم سب کی نجات ہے۔"

آ کا مرزا اپنی بات پر اَڑے ہوتے تھے۔ بولے۔ "آپ کا ارشاد بجا لیکن اعلیٰ حضرت یہاں سے بہت دُور ہیں سردست ہمارے ہی نام کا خطبہ پڑھ دیا جائے پھر جب بادشاہ آ جائیں گے تو اُن کے نام کا خطبہ شروع کرا دیا جائے گا۔"

شاید دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ آ کا مرزا منہ بناتے ہوتے باہر نکلے اور مجھے ایک بار پھر خشمگیں نظروں سے دیکھا۔ جلتے جلتے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے ایک دوسرے خیمے میں لے گئے۔ اُن کے تیور ہی سے میں نے اپنی قسمت کا فیصلہ پڑھ لیا تھا۔

وہ خود تو بیٹھ گئے لیکن مجھے کھڑا رکھا۔ بولے "ہم نے تو یہی چاہا تھا کہ تجھے کسی اعلیٰ منصب پر فائز کر دیں لیکن تو کوتاہ اندیش، کم ہمت اور بزدل ہے، تو نے اپنی عمر عزیز کا بہترین حصہ بلا وجہ ضائع کر دیا۔ اگر ہم تجھ سے یہ سوال کریں کہ تو نے اپنے منصوبے کو کس حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچایا تو تُو اُس کا کیا جواب دے گا؟"

میں نے جواب دیا۔ "آ کا مرزا! عملاً بادشاہ کا کام تمام ہو چکا ہے اور جسے خدا خود ہی ذلیل کر چکا ہو اسے انسان کیوں ذلیل کرے؟"

آ کا مرزا نے شاہانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔ اُن کے اطوار اور باتوں سے کوئی شخص بھی یہ محسوس کر سکتا تھا کہ آ کا مرزا میں ایک بادشاہ کا مزاج جلوہ گر ہے، اُن کا لہجہ درشت اور شاہانہ تھا۔ انہوں نے مجھے بُرا بھلا کہنا شروع اور صاف صاف جتا دیا کہ



"علی مرزا! اِس وقت تو دنیا کا بدقسمت ترین انسان ہے کیونکہ تو نہ تو آوارہ گرد ہمایوں کا اعتماد حاصل کر سکا اور نہ ہی ہماری نظر میں معتمد رہا۔ ہم تجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہیں اور تیرا آزاد رہنا ہمارے لیئے خطرے کا موجب ہے!"
اس کے بعد انہوں نے تالی بجائی اور مجھے چند سپاہیوں کے حوالے کرتے ہوتے حکم دیا۔ "اسے کابل کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔"
اس خلافِ اُمید حکم نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ اُسی وقت اُن سپاہیوں نے مجھے گرا دیا اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

آہ، میں اِن اذیتوں کو کِن لفظوں میں بیان کروں جو مجھے آ کا مرزا کی طرف سے پہنچائی گئیں۔ وہ تمام قدرتی نعمتیں، جنہیں انسان کوئی قیمت ادا کیئے بغیر حاصل کر لیتا ہے، مجھے اُن سے محروم کر دیا گیا۔ روشنی۔ میں ایک عرصے تک اس سے محروم رہا۔ ہوا۔ تنگ و تاریک کوٹھری کی گھٹن میں، میں ایک ایک جھونکے کو ترس گیا۔ ہم جنسوں کی آوازیں مجھے کچھ پتہ نہ تھا کہ میں اب بھی انسانوں کی دنیا میں ہوں یا گوشۂ قبر میں نکیرین کا منتظر ہوں۔ پانی۔ نیم گرم پانی نے میرے معدے کو تباہ کر کے رکھ دیا۔ کھانا۔ جو بھی ملتا اس میں نہ تو لذت ہوتی اور نہ مقدار میں اتنا ہوتا کہ میں پیٹ بھر سکتا۔ ایک مدھم سی شمع یوں روشن رہتی جیسے تاریک ترین رات میں آسمان پر نحیف اور کمزور سا ایک تنہا ستارہ۔ مجھے باہر کی دنیا کا کچھ پتہ نہ تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ شب و روز کا تصور تک ختم ہو چکا تھا، میری کوٹھری اُس کرے کی مانند تھی جہاں ہمیشہ رات رہتی ہو۔ اس ماحول نے میرے جملہ اعصاب کو متاثر کیا، ماضی کی یادیں اور اُن کا تصور میرے حق میں کتاب کی طرح تھا جسے پڑھ کر میں دل بہلانے کی کوشش کرتا رہتا۔ نامعلوم لیکن تاریک خیالی مستقبل قبر کی طرح منہ کھولے سامنے کھڑا تھا اور میں چیونٹی کی چال سے زندگی کا سفر طے کرتا اُسی کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔
ایک دن خلافِ معمول آ کا مرزا کی آواز سنائی دی، وہ ایک سائے کی طرح سامنے کھڑے مجھ سے مخاطب تھے۔
"علی مرزا! کیا تیرے ہوش و حواس اب بھی کام کر رہے ہیں؟"
میرا دل اس حد تک بجھ چکا تھا کہ اس آواز نے نہ تو مجھے خوش کیا نہ مشتعل۔

آکا مرزا نے کہا۔ "کیا تو یہاں سے نکلنا پسند کرے گا؟"

میں نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "میں موت کا منتظر ہوں آکا مرزا! آپ واپس جائیں اور مجھے مر جانے دیں۔"

وہ ہنسے اور میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لے آئے۔ مجھے یاد نہیں کہ وہ مجھ سے کیا کچھ کہتے رہے۔ سورج کی روشنی میں میری آنکھیں کام نہیں کر رہی تھیں اور مجھے پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ میری بصارت بہت زیادہ زائل ہو چکی ہے۔ میرے قدم لڑکھڑا رہے تھے، وہ چلنے کی عادت بھلا چکے تھے۔ کئی جگہ میں گرتے گرتے بچا۔

آکا مرزا مجھے ایک نہایت پُر تکلف کمرے میں لے گئے، مجھے وہاں کی ہر چیز دھندلی دھندلی نظر آتی تھی، حد تو یہ ہے کہ روشن جبیں دیر تک وہاں موجود رہی اور میں اسے پہچاننے تک سے قاصر رہا۔ آکا مرزا نے لذیذ ترین کھانے میرے سامنے رکھ دیے لیکن میری اشتہا ترک کی ختم ہو چکی تھی۔ جب میں نے کھانے سے بھی منہ موڑ لیا تو شاید آکا مرزا کو پہلی بار اپنے ظلم و جبر کا احساس ہوا اور شاید اپنی اس زیادتی پر پشیمان بھی ہوئے، بولے "علی مرزا! غلطیاں انسان ہی سے ہوتی ہیں، تم پر جو کچھ بیتی اس میں ہماری مرضی ہرگز شامل نہ تھی۔ ہم تو اِدھر اُدھر مہمات میں اُلجھے رہے اور تم قیدِ تنہائی بھگتتے رہے لیکن ہم جیسے ہی واپس آئے پہلے تمہارے پاس پہنچے۔" پھر روشن جبیں کو آواز دی۔ کہا۔ "روشن جبیں! کیا تم نے بھی علی مرزا کو نہیں پہچانا، اِدھر آ ؤ اِن کے قریب۔ علی مرزا کی بینائی کو شاید تاریکی کھا گئی ہے۔"

روشن جبیں جب بالکل میرے قریب آ گئی تو میں نے بھی اسے پہچان لیا۔ اس کی مغائرت اور اجنبیت کی روش سے مجھے یہ احساس گزرا کہ شاید وہ بھی اِس شکستہ انسان کو نہ پہچاننے ہی میں بہتری محسوس کر رہی ہے۔

آکا مرزا نے کہا۔ "علی مرزا! اگر تم چاہو تو روشن جبیں کے ساتھ کچھ وقت گزار لو۔"

میں نے افسردگی سے جواب دیا۔ "نہیں اب میں اس کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔"

آکا مرزا نے بھی مزید اصرار نہیں کیا اور سر کے اشارے سے روشن جبیں کو چلے جانے کا حکم دیا۔

تنہائی میں آکا مرزا دیر تک تسلی دلاسے دیتے رہے، انہوں نے مجھے یقین





دلایا کہ میرے جو اعضا بھی متاثر ہوئے ہیں وہ شاہی طبیب سے اُن کی پچھلی توانائی بحال کرا دیں گے۔ وہ کئی دن بعد حرفِ مطلب زبان پر لاتے ہوئے بولے۔ "علی مرزا! تم ہمارے دودھ شریک ہو اور یہ دودھ ہی کا اثر ہے کہ ہم تمہیں اس کال کوٹھڑی سے باہر نکال لائے۔ کیونکہ اِس حیثیت سے تم پر ایک فرض عائد ہوتا ہے کیا تم اسے پورا کرنے پر آمادہ ہو؟"

میں نے زبان کے بجائے آنکھوں سے پوچھا۔ "وہ کیا؟"

آکا مرزا چبا چبا کر بولے۔ "ہمایوں ایران پہنچ چکا ہے اور طہماسپ صفوی سے امداد کا طالب ہے، حالانکہ تمہیں یاد ہوگا کہ تم نے خود ہی ہم سے یہ کہا تھا کہ عملاً ہمایوں کا کام تمام ہو چکا ہے اب اس کی طرف سے فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں لیکن وہ تو بہت ہی سخت جان نکلا علی مرزا۔ ہمیں ڈر ہے کہ صفوی بادشاہ اسے مدد دے کر پھر سے بادشاہ نہ بنا دے، اب ہمیں ایک جنگ لڑنی ہے جو ہتھیار وں سے نہیں باتوں سے لڑی جائے گی!"

آکا مرزا اپنی باتوں کا تاثر جانچنے کے لیے رُک کے اور تیز نظروں سے میرا چہرہ دیکھنے لگے لیکن اس وقت میرا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ انہوں نے پوچھا۔ "علی مرزا! کیا تم ہماری باتیں سن رہے ہو؟ کیا تمہاری قوتِ سماعت صحیح کام کر رہی ہے؟"

میں نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "ابھی میں بہرا نہیں ہوا!"

آکا مرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم بہرے نہیں ہوئے، ہاں تو ہم یہ کہہ رہے تھے کہ تم ایران چلے جاؤ، ہمایوں سے ملو اور اسے ہمارے جبر و ظلم کی داستان سنا کر اپنے اعتماد میں لے لو، یہاں تک پہنچ جاؤ تب تم نہایت ہوشیاری سے کسی بھی طرح صفوی حکمران کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنا کہ ہمایوں ایک نااہل انسان ہے اسے کسی قسم کی بھی مدد دینا، اپنی دولت اور آدمیوں کا نقصان کرنا ہے۔ صفوی بادشاہ کو ہر قیمت پر ہمایوں کی دستگیری سے روکنا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گم صم پاگل کی طرح اُن کی صورت دیکھتا رہا — دھندلی دھندلی غبار آلود صورت۔

آکا مرزا نے پھر سوال کیا۔ "علی مرزا! تمہارے ہوش و حواس صحیح کام کر رہے ہیں؟"

میں نے پھر جواب دیا کہ "ہاں ابھی میں پاگل نہیں ہوا۔"

آکامرزا نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم پاگل نہیں ہوئے۔ تب پھر تم کب تک ایران چلے جاؤ گے۔ جب تم اپنے منصوبے میں کامیاب ہو کر واپس لوٹو گے تو قندھار کی حکومت تمہیں خوش آمدید کہے گی۔ اور روشن جبیں، اپنی دس حسین و جمیل کنیزوں کے ساتھ اپنی کشادہ آغوش سے تمہارا استقبال کرے گی!"

شاید پہلی بار میں مسکرایا اور اس گونگے کی طرح زبان کھولی، جو بولتے بولتے ایک دم، مدت مدید کے لئے خاموش ہو گیا ہو، اور سالہا سال کے بعد وہ پھر بولنے پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ میں نے اٹک اٹک کر کہا۔ "آکامرزا! گو کہ مجھ پر بڑے ظلم ڈھائے ہیں لیکن تم میرے دودھ شریک بھائی ہو۔ میں اب بھی تمہارا وفادار ہوں، مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تمہارے دل میں میرے لئے جو شکوک اور غلط فہمیاں پیدا ہو گئی تھیں وہ دور ہو گئیں۔"

"او ہمارے بھائی علی مرزا!" یہ کہہ کر آکامرزا مجھ سے لپٹ گئے اور دیر تک میری پیشانی اور شانوں کے بوسے لیتے رہے، میں نے بھی گرم جوشی سے یہی عمل دہرایا۔

اب میرے دل سے آکامرزا کا احترام نکل چکا تھا، اب وہ میری نظر میں ایک بد ترین خلائق انسان تھا۔

آکامرزا نے میری طرح کئی اور آدمی بھی اس منصوبے پر کام کرنے کے لیے ایران بھیج دیئے تھے۔ جب مجھے بادشاہ ہمایوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تو وہ کچھ دیر تک مجھے پہچان ہی نہ سکے۔ جب میں نے آکامرزا کے ظلم و جور کی داستان سنا کر بادشاہ سے اپنا تعارف کرایا تو انہیں بڑا افسوس ہوا۔ بولے۔ "کامران کو یہ ہو کیا گیا ہے، ہمیں یقین ہے کہ ظلم کی ناؤ، جس میں وہ سفر کر رہا ہے، ایک نہ ایک دن اسے ضرور لے ڈوبے گی۔"

اب میں واقعی بادشاہ کا اعتماد حاصل کرنا چاہتا تھا، میں نے اپنی آمد کی غرض و غایت بتا کر بادشاہ سے عرض کیا۔

"اعلیٰ حضرت! اب بہت زیادہ ہوشیاری کی ضرورت ہے، آکامرزا کے کئی آدمی اس مقصد سے ایران آئے ہیں کہ شاہ صفوی کو حتی الامکان آپ کی امداد و اعانت سے باز رکھیں۔"

بادشاہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دوپہر کے کھانے پر بادشاہ کے ساتھ مجھے بھی بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا شاہ طہماسپ صفوی ہمارا میزبان تھا۔ ایرانی امرا





ایک صف میں مؤدب ہمارے روبرو کھڑے تھے۔

صفوی بادشاہ نے ہمارے بادشاہ سے اچانک سوال کیا۔ "ہم حیران ہیں کہ آپ جیسا عظیم حکمران کس طرح اپنے کمزور دشمن سے شکست کھا گیا؟ شیر خان ایک معمولی امیر، مغلیہ سلطنت پر آخر کس طرح غالب آ گیا؟"

ہمارے بادشاہ نے آزردگی سے جواب دیا۔ "بھائیوں کا نفاق شیر خان کی مدد پر تھا جس سے وہ جیت گیا۔"

صفوی حکمران نے چونکا دینے والا سوال کیا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کا اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک اچھا نہ رہا ہو اور یہ کہ اب تک آپ ان کے ساتھ جس طرح پیش آتے رہے ہیں وہ ناپسندیدہ ہو۔"

ہمارے بادشاہ نے جواب دیا۔ "ہاں یہ ہماری نرمی اور مروت ہی تو تھی جس نے انہیں سر اٹھانے کا موقع دیا اگر ہم انہیں بھائی کی جگہ سرکش اور باغی سمجھتے اور ان سے ویسا ہی سلوک روا رکھتے تو شاید آج ہمیں یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔"

صفوی بادشاہ نے اپنے روبرو کھڑے ہوئے چھوٹے بھائی بہرام میرزا کو اشارے سے حکم دیا کہ وہ آفتابہ اور طشت لے کر آگے بڑھے اور بادشاہ کے ہاتھ دھلائے۔

شہزادہ بہرام میرزا ادنیٰ خادم کی طرح آگے بڑھا اور بادشاہ کے ہاتھ دھلانے لگا صفوی بادشاہ نے آنکھ کے اشارے سے بہرام میرزا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہمارے بادشاہ سے کہا۔ "بھائیوں کو اس طرح رکھنا چاہیئے!"

بہرام میرزا کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ شاید اسے اس بات سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ آکامرزا کے شاطر بھی کسی طرح اس واقعے سے آگاہ ہو گئے اور انہوں نے بہرام میرزا کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ کسی بھی طرح طہماسپ صفوی کو ہمایوں سے دست کشی پر آمادہ کر لے۔ چنانچہ سننے میں یہ آیا کہ بہرام میرزا نے کئی بار اپنے بڑے بھائی کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ "ہندوستان جیسے پڑوسی ملک پر امیر تیمور کی اولاد کی مضبوط حکومت ایران کے لیے ہمیشہ خطرے کا باعث رہے گی۔"

لیکن شاہ طہماسپ نے کسی بات کا کوئی اثر نہ لیا۔ اس نے ہمارے بادشاہ کو ایک شاندار دعوت دی، سات دن تک اس ضیافت کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ چھ سو شامیانے نصب کئے گئے اور بارہ مقامات پر شادیانے اور نقارے آٹھوں پہر بجتے رہے۔ شامیانوں کے

نیچے نہایت قیمتی شاہی دریاں بچھائی گئیں۔ پہلے دن تو عمدہ کھانے پینے تک ہی گرمی محفل رہی، دوسرے دن شاہانہ خلعت، مرصع شمشیر اور مرصع خنجر عطا ہوئے اور صفوی حکمران نے ہمارے بادشاہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا۔ اس تقریب میں جو اشیاء بھی موجود تھیں، ہمارے بادشاہ کو عطا کر دی گئیں۔ خیمے، چادر، قالین، گھوڑے، اونٹ اور خچر ایک بلند مقام پر جمع کر دیے گئے سلطنت اور لوازمہ سلطنت میں جو چیزیں بھی آتی ہیں وہ سب ہمارے بادشاہ کو عطا ہوئیں۔ شاہ صفوی نے اپنے بیٹے سمیت بارہ ہزار سواروں کی فوج مرحمت فرمائی اور کہا کہ اور سامان بھی فراہم کیا جائے گا۔

پھر صفوی بادشاہ کھڑا ہو گیا۔ ہمارا بادشاہ بھی احتراماً کھڑا ہوا۔ صفوی بادشاہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا اور ہمارے بادشاہ سے کہا۔ "ہمایوں بادشاہ! آپ کے لئے یہاں کوئی کمی نہیں۔"

اِدھر سے فارغ ہو کر بادشاہ قندھار پر حملہ آور ہوا۔ اور اسے فتح کر کے کابل روانہ ہو گیا۔ عمر کوٹ میں حمیدہ بانو سے بادشاہ کا ایک لڑکا پیدا ہوا تھا، جس کا بادشاہ نے جلال الدین اکبر نام رکھا تھا۔ ان دنوں یہ شہزادہ آکا مرزا کے قبضے میں تھا اس نے شہزادے کو قلعے کی فصیل پر عین اسی جگہ بٹھا دیا جہاں گولہ باری ہو رہی تھی لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔ مستقبل کے بادشاہ پر سات ولیوں کا سایہ تھا، زندہ رہا۔ بادشاہ نے کابل بھی فتح کر لیا۔ آکا مرزا اپنے کنبے کے ساتھ بچ نکلا۔

بادشاہ آکا مرزا کا تعاقب کرتا رہا! آخر تنگ آ کر اس نے بادشاہ سے رحم کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اسے پھر معاف کر دیا اور اپنے روبرو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان دنوں بادشاہ جلال آباد کے شمال میں تالیقان کے قلعے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میر خان ساماں کا قاصد بادشاہ کی خدمت میں عرض پرداز ہوا کہ "مرزا کامران حاضری کا خواستگار ہے۔"

بادشاہ نے بے چینی سے جواب دیا۔ "حاضر کرو۔"

قاصد کے جاتے ہی بادشاہ نے ایک فرمان جاری کیا کہ "مرزا کامران آ رہا ہے۔ وزرا اور امرا اس کے استقبال کو آگے بڑھیں اور خوشی کے نقارے بجائے جائیں۔"

نقاروں اور شادیانوں کی آوازوں میں آکا مرزا نمودار ہوا وزراء اور امراء فرش کے آس پاس اس کے استقبال کو کھڑے تھے جب وہ ان کے بیچ سے گزر کر اس فرش پہنچا جہاں مرزا ہندال بیٹھا ہوا تھا تو آکا مرزا نے وہیں بیٹھ جانا چاہا لیکن بادشاہ نے





سے حکم دیا۔ "وہاں نہیں، تم ہمارے قریب آؤ!"

آکا مرزا نے ایک امیر کی کمر سے رومال کھول لیا اور اسے اپنی گردن میں ڈال کر گرہ لگا لی۔ اس طرح وہ خود کو بادشاہ کا قیدی ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

جب وہ بادشاہ کے قریب پہنچا تو بادشاہ نے رومال کو کھول کر پھینک دیا اور کہا "کامران مرزا، تم ہمارے بھائی ہو، قیدی نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں!"

اس کے بعد آکا مرزا کو گلے سے لگا لیا۔ پھر شربت طلب کیا اور نصف پی کر بقیہ آکا مرزا کو پلا دیا۔

بادشاہ نے اس موقع پر بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ آکا مرزا کی مضطرب نظریں شاید مجھے تلاش کر رہی تھیں اور جب انہوں نے مجھے پا لیا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آکا مرزا اب بھی راہ راست پر نہیں آیا۔

کئی دن بعد بادشاہ نے کامران مرزا کو کولاب کا قلعہ مرحمت فرمایا۔ آکا مرزا بادشاہ سے رخصت ہو کر کولاب چلا گیا اور ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اطلاع آئی کہ آکا مرزا نے بادشاہ کے علاقوں پر تاخت و تاراج شروع کر رکھی ہے۔ بادشاہ نے پریشان ہو کر آکا مرزا سے کہلایا کہ "اب تم یہ کیا کر رہے ہو، اگر تم اور علاقہ چاہتے ہو تو ہم وہ بھی دے دیں گے!"

آکا مرزا نے اس کا یہ جواب دیا کہ "اعلیٰ حضرت! غلام نے فقیری اختیار کر لی ہے، مجھے اب سلطنت سے کوئی سروکار نہیں۔" لیکن اطلاعیں برابر یہی آتی رہیں کہ تارک الدنیا آکا مرزا لوٹ مار کا ایک بازار گرم کیے ہوئے ہے۔

اور ایک بار پھر جنگ و جدال کا سلسلہ چل نکلا۔ اس جنگ و جدال میں آکا مرزا کے ہاتھوں مرزا ہندال کو شہادت نصیب ہوئی۔ آکا مرزا شکستیں اٹھاتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا اور دریائے سندھ کے پار آدم گکھڑ کے پاس پناہ لی۔ آدم گکھڑ نے آکا مرزا کو قید کر کے بادشاہ کو مطلع کر دیا۔ بادشاہ دیوانہ وار آدم گکھڑ کے پاس پہنچے۔ آدم نے نہایت احترام اور آداب کے ساتھ بادشاہ کا استقبال کیا۔ بادشاہ نے آکا مرزا سے ملاقات کی۔ اس موقع پر ایک رکابی میں تربوز کی قاشیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ بادشاہ نے نصف خود کھائیں اور نصف قاشیں آکا مرزا کو بخش دیں۔

آکا مرزا کو قید میں پڑے ہوئے چار دن گزر گئے۔ اس دوران امراء، وزراء اور مفتیانِ دین میں بڑی گرم گرم بحثیں ہوتی رہیں۔ وہ سب بادشاہ کو یہ مشورہ دے رہے

تھے کہ اب آکا مرزا کو معاف نہ کیا جائے!

بادشاہ نے ایک رات مجھے طلب کیا اور مجھ سے دریافت کیا۔ "علی مرزا! کیا تو جانتا ہے کہ ہم تجھے کہاں بھیج رہے ہیں؟"

میں نے عرض کیا۔ "بندہ منشاءِ سلطانی سے لاعلم ہے!"

بادشاہ نے آکا مرزا کے خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا "اس خیمے کی اندرونی خدمت تیرے سپرد ہے، اب نیند تیرے لئے حرام ہے۔"

اس حکم کے بعد میں خیمے میں داخل ہو گیا۔ آکا مرزا نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے پہچانا ہی نہ ہو۔ عشاء کی نماز پڑھ کر آکا مرزا نے مجھ سے پوچھا۔ "علی مرزا! کیا بادشاہ ہمیں قتل کرا دیں گے؟"

میں نے طنزاً جواب دیا۔ "بادشاہ کے مزاج سے بادشاہ ہی واقف ہوگا۔"

پھر آکا مرزا نے مایوسی سے کہا۔ "بہر حال جو کچھ بھی ہو، علی مرزا! اصال ہمارے چند روزے قضا ہو گئے تھے کہ تم انہیں ہمارے عوض ادا کر دو گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "میں رکھ تو سکتا ہوں لیکن یہ قضا جناب خود ہی ادا فرمائیں تو مناسب ہوگا۔"

اس کے دوسرے دن مفتیانِ دین اور امراء نے مل جل کر ایک محضر نامہ تیار کیا جس کی ابتدا اس مصرعے سے کی گئی تھی۔

(درخت گر ملک سر افگند بر درخت گر۔ ملک کا سر قطع کر دیا جائے۔)

بادشاہ نے بدرجۂ مجبوری حکم دیا۔ "افسوس کہ ہم قتل کا حکم نہیں دے سکتے۔"

پھر فرمایا۔ "کامران کو اندھا کر دیا جائے۔"

اس حکم کے بعد بادشاہ وہاں سے ہٹ گئے۔ کئی طاقت ور اور توانا آدمی آکا مرزا کے خیمے میں داخل ہوئے۔ ان میں سے غلام علی نامی بھاری تن و توش کا سپاہی آگے بڑھا اور بڑے سے رومال کو لپیٹ کر گیند بنائی پھر اسے زبردستی آکا مرزا کے منہ میں ٹھونس دیا۔ آکا مرزا نے بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ دو آدمیوں نے ہاتھوں کو پیچھے باندھ دیا اور خیمے سے باہر لے آئے، وہاں کچھ لوگوں نے آکا مرزا کو زمین پر گرا دیا اور اس کے جسم اور ٹانگوں کو پوری طرح قابو میں کر کے آنکھوں میں نشتر چبھونے لگے۔ جب پانچ نشتر چبھوئے جا چکے تو آکا مرزا نے اپنی ٹانگوں پر بیٹھے ہوئے شخص سے کہا۔ "تو ہماری ٹانگوں پر کیوں بیٹھا ہے؟ انہیں تو چھوڑ دے!"





لیکن کسی نے بھی اس کی باتوں پر توجہ نہ دی اور کم و بیش پچاس نشتر دونوں آنکھوں میں چبھوتے گئے۔ اس کے بعد ایک شخص نمک دان لے کر آگے بڑھا اور چٹکیوں سے پسا ہوا نمک نشتر زدہ آنکھوں میں بھر دیا۔ درد کی شدت میں آکا مرزا "اللہ اللہ" کرتے رہے۔

مجھ سے آکا مرزا کی یہ حالت نہیں دیکھی گئی، میں بھاگ کر بادشاہ کے خیمے کے در پر کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد بادشاہ نے مجھے اندر طلب فرمایا اور پوچھا۔ "کیا ہمارے حکم پر عمل کر دیا گیا؟"

میں نے سہمے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اعلیٰ حضرت! حرف بہ حرف۔ آکا مرزا اندھے کر دیئے گئے!"

بادشاہ نے حکم دیا۔ "ہمارے غسل کے لئے پانی مہیا کیا جائے۔"

※ ※ ※

نابینا آکا مرزا نے بادشاہ سے مدینہ منورہ جانے کی اجازت طلب کی جو دے دی گئی، میں ان سے ملنے گیا۔ قدموں کی آہٹ سن کر دریافت کیا۔ "کون ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "علی مرزا!"

پوچھا۔ "اب کیا لینے آئے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "کچھ لینے نہیں دینے آیا ہوں۔"

دریافت کیا۔ "وہ کیا؟"

میں نے کہا۔ "ایک نصیحت۔ تم نے جو مظالم ڈھائے تھے اور جس جس طرح لوگوں کو ستایا تھا، تمہیں اس کا بدلہ اسی دنیا میں مل گیا!"

آکا مرزا کی اکڑ اب بھی وہی تھی۔ بولا۔ "ہم نصیحتیں نہیں سننا چاہتے۔"

میں نے کہا۔ "نہ سنو لیکن یہ تو بتا دو کہ روشن جبیں کہاں ہے؟"

آکا مرزا نے جواب دیا۔ "جو خود ہی اندھا ہو اسے کیا پتہ کہ کون کہاں ہے؟"

میں نے غصے میں کہا۔ "او ظالم انسان، تو نے تو میری بینائی کو نقصان ہی پہنچایا تھا لیکن خدا نے تیری بینائی ایک سرے سے چھین لی۔"

آکا مرزا خاموش رہا۔ اس کے بعد وہ مدینہ منورہ چلا گیا اور وہیں اس کا

انتقال ہو گیا۔

بادشاہ نے ہندوستان فتح کر لیا اور مجھے اس کے طفیل بڑا عزت و آرام میسر آیا لیکن روشن جبیں کا کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں چلی گئی ہاں اڑتا ہوا یہ سننے میں آیا ہے کہ آقا مرزا کے دور افراتفری اور ہنگامہ فرار و انتشار میں خود اس سے جتنی کنیزیں تھیں چھن گئیں اور اسے خود بھی یہ معلوم نہ ہو سکا کہ روشن جبیں کس کے قبضے میں چلی گئی۔

دھندلی بینائی اور غبار آلود نظروں کے سامنے جب بھی کوئی عورت اچانک آتی ہے تو میں غلطی اور خوش فہمی سے یہ سمجھ بیٹھتا ہوں کہ شاید روشن جبیں میری محبت کے ہاتھوں بے قرار ہو کر ڈھونڈتی تلاش کرتی میرے پاس آ گئی ہے لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔